غالب کے چند پہلو

شمس الرحمٰن فاروقی

انجمن ترقی اردو پاکستان

غالب کے چند پہلو

شمس الرحمن فاروقی

انجمن ترقی اردو پاکستان
ڈی۔۱۵۹، بلاک ۷، گلشن اقبال
کراچی۔۷۵۳۰۰

سلسلۂ مطبوعات انجمن ترقی اردو پاکستان ۵۵۹
ISBN-969-403-096-X

(دیگر سرکاری امداد یافتہ اداروں کی طرح
انجمن ترقی اردو پاکستان کو بھی اشاعت کتب کے لیے
اکادمی ادبیات پاکستان کے توسط سے امداد ملتی ہے)

انتساب

حضرت مولانا امتیاز علی عرشی (۱۹۰۴ء تا ۱۹۸۱ء)

حضرت علامہ مالک رام (۱۹۰۶ء تا ۱۹۹۳ء)
کی غالب شناسیوں
کو خراجِ عقیدت کے طور پر، کہ ان کی تحریریں سرزمین
غالب میں میری مشعلِ راہ بنیں۔

گرچہ ہر قرنے سخن آرے بود
لیک گفتِ سالکاں یارے بود

تمہید

غالب پر کوئی نئی یا معنی خیز بات کہنا اب آسان نہیں رہا۔ لہٰذا اب غالب پر وہ لکھے جسے اپنی رسوائی مطلوب ہو۔ لیکن جب ابرام دوستاں ہو تو استغنا بھی تقریباً اتنا ہی مشکل ہو جاتا ہے۔ شاید اسی لیے سی۔ ایس۔ لوئس نے اپنے ایک مجموعۂ مضامین کا نام رکھا تھا، They Asked for a Paper۔ اس مختصر کتاب میں جو تحریریں شامل ہیں وہ فرمائش یا مجبوری کے تحت ۱۹۸۳ء سے ۱۹۹۸ء کے درمیان لکھی گئی تھیں۔ کتابی شکل میں ان کی اشاعت برادر مکرم جناب میرزا جمیل الدین عالی کی توجہ اور اصرار کے باعث ممکن ہو سکی ہے۔ میں ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ ''غالب افسانہ'' میرے افسانوں کے مجموعے ''سوار اور دوسرے افسانے'' میں بھی شامل ہے۔ اس مجموعے کی اشاعت اجمل کمال کے ادارے ''آج'' کی مطبوعات سے متوقع ہے۔ میں اجمل کمال اور جمیل الدین عالی کا ممنون ہوں کہ اُنھوں نے ان دونوں مجموعوں میں اس افسانہ نما مضمون کی اشاعت منظور کر لی۔

شمس الرحمٰن فاروقی

الہٰ آباد،
۱۱ / اکتوبر ۲۰۰۰ء

فہرست

جمیل الدین عالی
معتمد اعزازی

حرفے چند

شمس الرحمٰن فاروقی جیسے نابغہ روزگار کے ایک مختصر سے مجموعہ مضامین پر حرفے چند لکھنے کی سعادت بھی حاصل ہوئی تو کب

جب ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

لیکن ان کی شہرت و عظمت اب اس درجہ اونچی ہو چکی ہے کہ ان کے مداحوں کی صف میں شامل ہوئے بغیر نہیں رہا جاتا۔ بعض شعر ایسے ہوتے ہیں جو دل کی تڑپ زبان پر لے ہی آتے ہیں۔

"غالب کے چند پہلو"، غالب کے چند نہیں ہزار پہلو ہیں۔ غالب ہمارے واحد شاعر ہیں جن کی تفسیر و تعبیر تاحال تو غیر مختتم رہی ہے اور کسی گنجینۂ معنی کا طلسم ایک ہی مرتبہ پیدا نہیں ہو جاتا۔ ایک ہی مرتبہ اپنے سارے راز نہیں کھول دیتا . . میں کوئی استاد انگریزی نہیں، لیکن یہاں بھی خبریں آتی ہیں اور تقریباً ہر سال کے دورہ انگلستان و امریکہ میں بھی ملتی ہیں کہ پچھلے سال یا پچھلے دہ سالوں میں شیکسپیر کے کچھ بالکل نئے گوشے سامنے آئے ہیں . . . خود بقول شمس الرحمٰن فاروقی بعض بڑے لوگ بہ ظاہر سامنے کی باتوں میں ایسے ایسے گنجینے رکھ جاتے ہیں جن سے بڑے بڑے علما و مفسرین آسان گزر جائیں مگر جب ان کے معانی و مطالب . . . . اور اشارے . . . . . سامنے آئیں تو دل دہلا دیں۔

شمس الرحمٰن فاروقی کو ان کے بے شمار عدیم النظیر کارناموں پر بھارت کے وہ تمام ادبی اعزازات مل چکے ہیں جو وہاں (اور یہاں) کسی بھی ادبی کارکن کا استحقاق ہو سکتے تھے۔ آخر کسی حوالے سے تو ملے . . . . ملتے رہے . . . ہوں گے . . . یہ ان کی فہرست سازی کا موقع

نہیں۔ مختصر یہ کہ آج وہ پاک بھارت کی اردو دنیا میں ایک ناقابل فراموش حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ کتاب در کتاب کے مستحق۔ میں انھیں ذاتی طور پر تقریباً نہ جاننے کے برابر جانتا ہوں مگر جزوی اختلاف رائے کے باوجود ایک بڑا محقق بڑا نقاد مانتا ہوں۔ اگر کبھی پاک بھارت میں ادبی اعزازات کا تبادلہ نکلا تو شمس الرحمٰن فاروقی صرف دو ڈھائی دوسرے محترمین ہی کے ساتھ ہماری صف اوّل میں ہوں گے۔ لیکن، اللہ انھیں صحت کاملہ عطا فرمائے۔ آمین۔ بہتوں کی طرح میری بھی خواہش ہے کہ جس طرح انھوں نے میر تقی پر وہ تاریخ ساز کام کیا ہے اتنی مقدار کا نہ سہی، اس معیار کا کوئی کام غالب پر بھی کر گزریں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ ممکن ہے اور دنیا بھر میں غالبیات کے ذخیرے اس اضافے کے منتظر ہیں۔

انجمن کو یہ مسودہ پچھلے سال، پورے چار برس زمینی سفر کے بعد ملا۔ حیرت مگر پاک ہند کے کئی تعلقات اس سے زیادہ حیرت میں مبتلا رکھتے ہیں۔ بہر حال اب یہ قارئین کی خدمت میں حاضر ہے اس قوی امید کے ساتھ کہ بہت سے اہل نظر ان کی تفہیم اور موقف تعبیر پر رائے زنی کریں گے۔ اگر ہمیں معقول تعداد میں ایسے مقالے اور مباحث وصول ہوئے تو ہم انھیں فاروقی صاحب کو بھی بھیج دیں گے اور اگر انھوں نے جواب یا وضاحت کو ضروری سمجھا تو اگلے ایڈیشن میں اس کتاب اور ان آرا (طویل مضامین نہ ہوں) کی اشاعت کر دی جائے گی۔ انشااللہ

۱۵جون ۲۰۰۱ء

تمہید

ہر زمانہ شعرائے سلف کو اپنے طریقے سے پڑھتا ہے۔ ہر زمانے کی ترجیحات مختلف ہوتی ہیں اور ہر زمانہ اپنے ذوق کے مطابق اشعار اور شعرا کی درجہ بندی کرتا ہے۔ بڑے شاعر کے اکثر اشعار پر ہر زمانے میں اتفاق رائے کے باوجود ان اشعار کی معنویت اور مختلف اشعار کے مابین قبولیت اور ترجیح بھی مختلف ہوتی ہے۔ گزشتہ بیس پچیس برس میں جس غالب سے ہم آشنا ہوئے ہیں وہ بڑی حد تک بجنوری اور شیخ اکرام کے غالب سے مختلف ہے۔ لیکن قرائن بتاتے ہیں کہ اب جو غالب ہمارے سامنے آئے گا وہ گزشتہ ربع صدی کے بھی غالب سے تھوڑا بہت مختلف ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اب غالب اور دوسرے کلاسیکی شعرا کو اردو کے کلاسیکی معیاروں اور اردو کی کلاسیکی شعریات کی روشنی میں پڑھنے کی کوشش شروع ہو رہی ہے۔

غیر شعوری طور پر سہی، لیکن حالی نے یہ بات کم وبیش ثابت کر دی تھی کہ غالب کو اگر مغربی شعریات کی روشنی میں پڑھا جائے تو ہم انھیں بہتر طور پر سمجھ سکیں گے۔ لیکن حالی کی بات اتنی ہی نہیں تھی۔ انھوں نے بھی ثابت کیا کہ غالب کو ہم مغربی معیاروں سے پرکھیں تو وہ بڑے شاعر ثابت ہوں گے۔ یہ اور بات ہے کہ مغربی معیاروں کے بارے میں حالی کی معلومات زیادہ گہری نہ تھی، لیکن ان لوگوں سے تو زیادہ ہی تھی جو "مقدمہ شعر و شاعری"

پڑھ کر شاعری کی ماہیت تک پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ حالی کے بعد غالب پر جو کچھ لکھا گیا اس پر مغربی معیاروں کا اثر بہر حال نمایاں ہے۔ طباطبائی کہنے کو روایتی قسم کے شرح نگار تھے، لیکن ان کی شرح غالب (۱۹۰۰ء) میں مغربی اثرات صاف نظر آتے ہیں۔ پھر یہ سلسلہ بجنوری سے ہوتا ہوا، آل احمد سرور، احتشام حسین، مجنوں گورکھپوری، آفتاب احمد، کلیم الدین احمد وغیرہ تک آیا اور پھر ہم اسے محمد حسن عسکری، سلیم احمد، وزیر آغا، حامدی کاشمیری وغیرہ تک پھیلتا دیکھ سکتے ہیں۔ غالب صدی تقریبات کے دنوں میں غالب کی شرح و تفہیم پر نئے سرے سے زور دیا گیا اور گیان چند نے غالب کے اس سارے کلام کی شرح لکھی جو متداول دیوان سے خارج تھا اور جسے بجنوری اور پھر آسی کے بعد (اکا دکا شعروں کے علاوہ) توجہ سے محروم رکھا گیا تھا۔ گیان چند کی شرح ان کی شعر فہمی اور نکتہ رسی کا زندہ ثبوت تو ہے، لیکن ان کے مغربی تعصبات بھی اس میں جھلکتے ہیں۔ یعنی وہ خیال بندی کی شاعری کو نظر استحسان سے نہیں دیکھتے۔

غیر متداول کلام کے ہر ہر شعر کی شرح انتہائی عرق ریزی اور جاں فشانی سے لکھنے کے باوجود، گیان چند کو خیال بند اور تجرید پسند غالب سے ہمدردی نہیں پیدا ہوئی۔ ان کا خیال یہی رہا کہ غالب نے جس کلام کو سوچ سمجھ کر مسترد کر دیا تھا، وہ بڑی حد تک معمولی اور بے لطف ہے۔ کیوں کہ اس میں غیر ضروری پیچیدگی زیادہ ہے، معنی کا لطف کم۔ اس رائے سے پورا اتفاق ممکن نہیں، لیکن یہ ضرور درست ہے کہ مسترد کلام کا بڑا حصہ اس قدر ادق، اس کے مضامین اس قدر باریک (اور ان مضامین اور پیکروں اور استعاروں کی بنیاد اتنے دور از کار روابطِ خیال پر ہے کہ اس کو سمجھنے کے لیے کثیر غور و فکر درکار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان اشعار میں بظاہر ربط کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ ربط کی جس کمی کو غالب نے "مستی تحریر" کا نام دیا ہے:

> ے کشِ مضموں کو حسنِ ربط خط کیا چاہیے
> لغزشِ رفتارِ خامہ مستیِ تحریر ہے

لیکن اس "مستی تحریر" کے باعث شعر کا حسن اگر مجروح نہیں تو مخفی ضرور ہو جاتا ہے۔

بہر حال، نسخۂ حمیدیہ اور پھر نسخۂ شیرانی کے متداول ہو جانے پر یہ بات غلط ثابت ہو جانی چاہیے تھی کہ غالب کا ادائیگی کلام سراسر مشکل ہے۔ لیکن کوئی بات اگر مشہور ہو جائے (خاص کر غلط بات) تو اسے لوگوں کے حافظے اور یقین سے خارج کرنا تقریباً ناممکن ہو جاتا ہے۔ چنانچہ یہ بات اب بھی عام ہے کہ غالب نے شروع شروع میں بہت "مشکل" لکھا اور بعد میں وہ "طرز میر" کی طرف مائل ہوئے۔ مالک رام نے بہت پہلے کہا تھا کہ غالب کی اکثر غزلیں جنھوں نے غالب کو غالب بنایا۔ زمانۂ نوجوانی یا جوانی کی ہیں نہ کہ اس زمانے کی جب وہ مشکل پسندی ترک کر چکے تھے۔ اس کے باوجود یہ بات مشہور ہے کہ غالب کا ادائیگی کلام سارے کا سارا ادق اور بے لطف اور ژولیدہ فارسیت (بلکہ فارسی) میں غرق ہے۔ پھر بھی ان غلط فہمیوں کے باوجود غالب کے پورے کلام پر توجہ گزشتہ پچیس تیس برس کے مطالعات غالب کا نمایاں پہلو ہے۔

تمام بڑے شعرا کی طرح غالب میں بھی یہ صفت ہے کہ ان کا کلام چاہے جتنی بار پڑھا جائے اس کی تازگی برقرار رہتی ہے زیادہ تر مطالعے میں بعض ایسے شعر سامنے آتے ہیں جو لہجے یا معنی کے اعتبار سے بالکل نئے معلوم ہوتے ہیں اور تعجب ہوتا ہے کہ اب تک یہ آنکھوں سے اوجھل کس طرح رہے تھے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ بڑے شاعر کے کلام میں فن کی باریکیاں اور چالاکیاں اور معنی کی تہیں اس قدر ہوتی ہیں کہ بسا اوقات ان شعروں میں بھی نئے پہلو نظر آجاتے ہیں جنھیں ہم بار بار پڑھ چکے ہوتے ہیں۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ کسی پڑھنے والے پر کبھی کوئی نکتہ اچانک روشن ہوتا ہے جب کہ دوسرا پڑھنے والا اس نکتے کو پہلے ہی دیکھ چکا ہوتا ہے۔ اس طرح ہر پڑھنے والے کے لیے ہر بار تازگی کا سامان مہیا رہتا ہے۔ غالب کے یہاں ایک اور خصوصیت بھی ہے جو عام طور پر ہمارے شعرا کے یہاں نہیں ملتی۔ اس خصوصیت کو یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ وہ بعض اوقات سرسری سی بات کہہ دیتے ہیں اور پڑھنے یا سننے والا اس شعر پر سے یوں ہی گزر جاتا ہے۔ لیکن غور و فکر کے بعد (اور کبھی کبھی اچانک) انکشاف ہوتا ہے کہ بات سرسری نہیں، بلکہ تہہ دار ہے۔ لہٰذا یہ امکان ہمیشہ رہتا ہے

کہ جس شعر کو ہم غیر اہم سمجھ رہے ہیں وہ دراصل اہم ہو۔ مثلاً ایک مشہور اور بہ ظاہر سادہ سا شعر ہے:

آگے آتی تھی حال دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

یہاں بہ ظاہر کوئی نکتہ نہیں۔ لیکن اچانک منکشف ہوتا ہے کہ دوسرے مصرعے کا مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ: ہنسی کسی بات پر نہیں آتی، بلکہ بے بات کی بات پر ہنسی آتی ہے۔ اب یہ شعر یاس و افسردگی کی جگہ جنون اور ذہنی اختلال کے مضمون پر مبنی ہوتا ہے۔ غالب کی اس خصوصیت کے باعث ان کا انتخاب بنانا بہت مشکل ہے، کیوں کہ عجب نہیں کہ جس شعر کو ہم نظر انداز کر گئے ہوں اس میں بھی کوئی نکتہ ہو۔

غالب زمانہ حال کا مقبول ترین شاعر

غالب ہمارے سب سے بڑے شاعر ہیں کہ نہیں؟ اس سوال پر بحث ہو سکتی ہے۔ اکثر لوگ اس سوال کا جواب "ہاں" میں دیں گے۔ لیکن یہ بات بالکل طے ہے کہ غالب ہمارے آخری بڑے کلاسیکی شاعر اور پہلے بڑے جدید شاعر ہیں۔ وہ اگر چہ اس صدی کے شروع ہونے سے بہت پہلے مر گئے لیکن ان کا کلام اس صدی کا استعارہ اور ان کے بیان کردہ مسائل اس صدی کے مسائل کا جوہر ہیں۔ لہٰذا غالب کا مطالعہ اس نقطۂ نظر سے ہی ہو سکتا ہے کہ کلاسیکی شعرا میں غالب کا کیا مقام ہے اور وہ اس نقطۂ نظر سے بھی ہو سکتا ہے کہ وہ کون سے خواص اور صفات ہیں جن کی بنا پر غالب ہمارے عہد کے سب سے مقبول اردو شاعر ہیں؟ میں فی الحال اس دوسرے ہی سوال کا جواب دینے کی کوشش کرتا ہوں۔

یہ بات تو سامنے کی ہے کہ شاعری کے اعتبار سے ہماری صدی استعارے اور ابہام کی صدی ہے اور غالب کی شاعری کے نمایاں ترین اوصاف اس میں استعارے کی وسعت اور رنگارنگی اور ابہام کی پیدا کردہ کثیر المعنویت ہیں۔ لیکن بات یہاں ختم نہیں ہوتی، بلکہ شروع ہوتی ہے۔ کیوں کہ اصل سوال یہ ہے کہ غالب نے استعارے کو کس طرح برتا؟ کیا استعارے سے غالب نے انکشاف کا کام لیا یا اس کے ذریعے عام، معمولی حقائق میں بھی اسرار کی کارفرمائی ثابت کی؟

کیا استعارے کو ادراک وانکشافِ حقیقت کا ذریعہ کہہ سکتے ہیں؟ یہ بحث مغربی شعریات میں فلسفے سے اٹھی، خاص کر جب ہیوم نے اس بات سے انکار کیا کہ استعارے کے ذریعے علم

حاصل ہو سکتا ہے۔ اسی زمانے میں اسپنوزا نے انجیل کی تعبیر و شرح کے مسائل سے بحث کرتے ہوئے یہ سوال اُٹھایا کہ انجیل کے بیانات کو استعارے کی سطح پر قبول کیا جائے یا لغوی سطح پر؟ یہ سوال اس لیے اہم تھا کہ دونوں طرح کی کار گزاریوں میں انجیل کے احکام و اقوال کی عملی معنویت اور ان کا مبنی بر حقیقت ہونا معرض خطر میں پڑ سکتا تھا۔ اسپنوزا نے بالآخر یہ فیصلہ کیا کہ ہمیں انجیل کے الفاظ کو لغوی حیثیت میں قبول کرنا چاہیے اور اس بات سے بحث نہ کرنا چاہیے کہ ان کو سچ بھی ثابت کر سکتے ہیں کہ نہیں۔

عرب شعریات میں استعارہ وسیلۂ علم کے طور پر نہیں بلکہ توسیعِ معنی کے وسیلے کی حیثیت سے برتا گیا ہے۔ یعنی عرب شعریات (اور بڑی حد تک تمام کلاسیکی مشرقی شعریات) میں استعارے کا اصول یہ نہیں ہے کہ اس کے ذریعے کوئی بات ثابت یا منکشف کی جاتی ہے۔ بلکہ یہاں استعارہ اس لیے اہم ہے کہ اس کے ذریعے بعض اوقات وہ معنی بھی وجود میں آتے ہیں جو کلام (Discourse) سے منطقی تعلق نہیں رکھتے، بلکہ اشاریاتی Semiotic تعلق رکھتے ہیں۔ امام عبدالقاہر جرجانی نے دو طرح کے استعاروں میں فرق کیا ہے۔ ایک تو وہ جن کی بنیاد حسیاتی ہوتی ہے۔ جرجانی کا قول ہے کہ ایسے استعاروں کے معنی متعین ہو سکتے ہیں۔ دوسری طرح کے استعارے وہ ہیں جن کی بنیاد عقلی ہوتی ہے۔ جرجانی کا کہنا ہے کہ ایسے استعاروں کے معنی لامحدود ہوتے ہیں۔

غالب نے اپنی تحریروں میں جرجانی کا حوالہ کیوں نہیں دیا ہے اور نہ کہیں استعارے سے بحث کی ہے۔ لیکن چوں کہ ان کا مشرقی شعریات، شعری ذوق اور خاص کر سبک ہندی کی شعریات کا ساختہ پرداختہ تھا۔ اس لیے ان کے یہاں جرجانی کے بیان کو وہ دوسری قسم کے استعارے کی کار فرمائی بیش از بیش نظر آتی ہے۔ غالب کے یہاں ان استعاروں کا عمل انکشاف کا نہیں بلکہ سوالیہ نشان کا ہے۔ یعنی غالب کے استعارے ہمیں کائنات اور وجود کے بارے میں استفہام و استفسار پر مائل کرتے ہیں۔ بیسویں صدی کا مزاج چوں کہ استفہام اور تجسس سے عبارت ہے، اس لیے غالب کا کلام (جیسا کہ میں نے اوپر کہا) بیسویں صدی کا ہی

استعارہ بن گیا ہے۔

نوآبادیاتی ذہن اور تہذیبی بحران

غالب کے بارے میں یہ بات بار بار کہی گئی ہے کہ وہ ایسے دور میں پلے بڑھے جو ہندوستانی سیاست اور سماج میں زوال اور انتشار کا دور تھا۔ یہ بات صرف جزوی طور پر سچ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ زوال اور انتشار تو غالب کی پیدائش سے بھی پہلے شروع ہو چکا تھا۔ سیاسی اعتبار سے زوال کا دور اٹھارویں صدی کے وسط سے ہی شروع ہو جاتا ہے۔ غالب کے دور اور اس سے ماقبل زمانے میں اصل فرق یہ ہے کہ غالب کے زمانے میں ہندوستانی تہذیبی اقدار کی بھی قوت اور سچائی مشکوک نظر آنے لگی تھی۔ وہ اقدار جو غالب سے نصف صدی پہلے پامال ہونا شروع ہو گئی تھیں، اب ان کے بارے میں یہ شک پیدا ہو چلا تھا کہ ان اقدار میں یہ قوت ہے بھی کہ نہیں کہ وہ انسان کو کائنات میں قائم رہنے اور کائنات کے موجودات و امکانات کی وجہ بیان کرنے کی سعی میں ممد ہو سکیں۔ غیر ملک، غیر زبان، غیر تہذیب، یہ چیزیں میر کے زمانے میں اہمیت نہ رکھتی تھیں۔ اس زمانے میں لوگوں کو پھر بھی یہ یقین تھا کہ وجود کے بارے میں جن نظریات اور تصورات کے وہ حامل ہیں وہ صحیح اور کافی ہیں۔ غالب کے زمانے میں اس یقین پر کاری ضرب پڑی اور زندگی کے ہر شعبے، حتیٰ کہ تہذیبی اقدار میں بھی مغربی اثرات کی برپا کردہ تبدیلیاں نظر آنے لگیں۔ اس تبدیل حال کا سب سے بڑا نتیجہ یہ ہوا کہ غالب جیسے ذہنوں کو، جو پرانی تہذیب کے پاسدار تھے، لیکن جنھیں بدلتی ہوئی دنیا کا احساس بھی تھا، وجود کی سطح پر یہ خوف اور شک پیدا ہوا کہ اشیا اور حقائق کیا واقعی ویسے ہی ہیں جیسے کہ ان کے بزرگوں کے تصور کائنات (World View) میں تھے یا اشیا اور حقائق کچھ اور ہیں؟ یا اگر وہ کچھ اور نہیں بھی ہیں، تو کیا ان کو دیکھنے کے طریقے کچھ اور بھی ہیں اور یہ طریقے ان طریقوں سے مختلف ہیں جو انھوں نے اپنی تہذیب، اپنی تاریخ اور

اپنے تہذیبی شعور سے حاصل کیے تھے؟

اشیا دراصل ویسی نہیں ہیں جیسی وہ نظر آتی ہیں، یہ صوفیوں اور فلسفیوں کا عام مقولہ ہے۔ اس مقولے تک پہنچنے کے لیے غالب اور ان کے معاصروں کو مغربی تہذیب یا مغربی علم کی ضرورت نہیں تھی۔ لیکن صوفی اور فلسفی کا یہ کہنا کہ عالم "ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے" اور معنی رکھتا تھا اور مغربی تہذیب کی روشنی میں یہ معلوم کرنا اور معنی رکھتا تھا کہ "ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے" کے وہ معنی نہیں ہیں جو مشرقی صوفیوں اور فلسفیوں نے بیان کیے تھے۔ اس حوصلہ شکن دریافت نے ہند اسلامی تہذیب میں ایک بحران پیدا کر دیا۔ غالب اسی تہذیبی بحران کے شاعر ہیں اور یہ بحران اب بھی ہمارے ساتھ ہے۔ اس لیے غالب ہمیں آج بھی ہمارے معاصر نظر آتے ہیں۔ غالب کے اہم معاصرین ذوق، مومن، میر انیس پھر درجہ دوم کے اہم شعرا مثلاً اصغر علی خاں نسیم وغیرہ سب اس بحران سے بے خبر تھے جو ہماری تہذیب میں انگریزوں کے اثر سے رونما ہو رہا تھا اور بڑی حد تک رونما ہو بھی چکا تھا۔ غالب کی بڑائی کا راز بنیادی طور پر اس بات میں ہے کہ اُنھوں نے اس بحران کو نہ صرف محسوس کیا، بلکہ اسے شعر بنا کر پیش بھی کیا۔

اس بحران کو محسوس کرنے سے اور شعر بنا کر پیش کرنے سے میری مراد یہ نہیں ہے کہ غالب نے زمانہ "نوجوانی ہی میں" "داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی" جیسے شعر کہہ لیے تھے۔ اس بحران کو محسوس کرنے اور اسے شعر میں منتقل کرنے سے میری مراد یہ ہے کہ غالب نے اس بات کو اپنے کلام کا بنیادی استعارہ بنایا کہ اشیا جیسی نظر آتی ہیں وہ ان کی اصل صورت نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غالب نے استفہامیہ کا استعمال تمام اردو شعرا سے زیادہ کیا ہے۔ حتیٰ کہ میر سے بھی زیادہ۔ یعنی اشعار کے تناسب کے اعتبار سے غالب کے یہاں استفہامیہ اشعار کا تناسب میر سے زیادہ ہے۔ جس شخص نے اپنے دیوان کا آغاز ہی استفہام سے کیا ہو اور اس استفہام کے ذریعے نظام کائنات پر نکتہ چیں انداز میں نظر ڈالی ہو، اس کے استفہامی مزاج کے بارے میں زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں:

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

اس کے مقابلے میں میر کو رکھیے کیوں کہ میر خود بہت بڑے استفہامی ہیں:

کوئی ہو محرم شوخی ترا تو میں پوچھوں
کہ بزمِ عیشِ جہاں کیا سمجھ کے برہم کی

جیسا کہ میں نے کہا، میر خود بہت بڑے استفہامی ہیں۔ لیکن ان کا استفہام (مندرجہ بالا شعر میں) دو مضمرات کا حامل ہے۔ اوّل تو یہ کہ کوئی نہ کوئی ہستی یا شخص ایسا ہے جو ذات باری تعالیٰ کی "شوخی" کا "محرم" ہو۔ دوسری بات اس استفہام میں یہ مضمر ہے کہ باری تعالیٰ کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں، اس لیے اگر اس نے بزمِ عیشِ جہاں برہم کی بھی ہے، تو اس کا راز اس کو معلوم ہوگا جو ذاتِ باری کا محرم ہے۔ غالب کے شعر میں دونوں ہی مضمرات کا پتا نہیں۔ صرف مطلق استفہام ہے کہ وہ کون ہے جس کی شوخیِ تحریر نے نقش کو کاغذی پیرہن پہنادیا۔ (کاغذی پیرہن پہننا، فریادی ہونا۔) اس پر طرہ یہ کہ نقش وجود میں آتا ہی تب ہے جب وہ کاغذی پیرہن پہنے۔ لہٰذا وجود خود مساوی ہے فریاد کے۔ تو یہ کس کی شوخی ہے جس نے وجود = فریاد کی تکوین کی؟

ذہنی جغرافیے اور رسوم میں تبدیلی

میں نے اوپر کہا ہے کہ غالب تہذیبی بحران کے پیدا کردہ اس احساس کے شاعر ہیں کہ اشیا ویسی نہیں ہیں جیسی نظر آتی ہیں، حقائق وہ نہیں ہیں جو ہمیں سکھائے گئے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غالب کے یہاں رفتار = جمود، وجود = عدم، عقل = وحشت، غیب = ظہور، نظارہ = نابینائی جیسے مضمون عام ہیں۔ لیکن اس سے بھی آگے بڑھ کر غالب نے اس ذہنی جغرافیے کو بھی بدل دیا اور اس داخلی سرزمین کی آب و ہوا بھی بدل دی جن سے غزل کی شاعری عبارت ہے۔ یہاں بھی میر سے تقابل خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ میر کے یہاں داخلی

جغرافیہ اور تہذیبی آب وہوا کے بدلنے یا اس میں تبدیلی ممکن ہونے کا ذکر نہیں۔ میر کی دنیا خود مکتفی ہے، اس میں انسان زبون وخوار بھی ہے اور منصور ومظفر بھی۔ لیکن اس میں کوئی تغیر نہ تھا۔ عشق کے جنگل کی دہشت ناکی ایسی تھی کہ وہاں شیروں کو بھی قشعریرہ ہو اور جہاں خود خضر کو جان کا خطرہ ہو:

کیا کم ہے ہولناکی صحرا سے عاشقی کی
شیروں کو اس جگہ پر ہوتا ہے قشعریرہ
ملا جو عشق کے جنگل میں خضر میں نے کہا
کہ خوفِ شیر ہے مخدوم یاں کدھر آیا
(میر)

لیکن غالب کے یہاں جغرافیہ بدلا ہوا ہے۔ غالب کے صحرا میں خضر کا گزر ہی نہیں۔ اس صحرا کے دیوانے سرحد تماشا سے بہت دور ہیں اور خود خضر کو ان سے ملنے کا اشتیاق ہے:

سیر آں سوے تماشا ہے طلب گاروں کا
خضر مشتاق ہے اس دشت کے آواروں کا

یہ اور بات ہے کہ فنی اعتبار سے میؔر کے دونوں شعر غالب کے شعر سے بہتر ہیں۔ لیکن یہاں جو چیز لائق توجہ ہے وہ میؔر اور غالؔب کا فنی تقابل نہیں بلکہ وہ ذہنی آب وہوا اور داخلی جغرافیہ ہیں جن سے میر اور غالب کے اشعار عبارت ہیں:

اسد ہم وہ جنوں جولاں گدائے بے سروپا ہیں
کہ ہے سرپنجۂ مژگانِ آہو پشت خارا نیا

یہاں جنوں جولانی اور بے سروپائی مساوی ہیں اور ظاہر ہے کہ وہ دشت جس میں کوئی بے سروپا شخص جنوں جولاں ہو، اس دشت سے مختلف ہو گا جس میں خوفِ شیر ہو۔ کیوں کہ اس دشت کے ہونے کی دلیل ہی اس کا نہ ہونا ہے جیسا کہ اس شعر میں ہے:

ہر قدم دوریِ منزل ہے نمایاں مجھ سے
میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

یعنی رفتار جتنی تیز ہوگی، بیاباں اتنی ہی تیزی سے دور ہوتا جائے گا۔ لہٰذا رفتار برابر ہے جمود کے اور بیاباں کا وجود اس کے عدم ہی میں مضمر ہے۔

مروّج مفروضات اور معتمد اقدار کو پلٹنے دیا ان کا عکس بیان کرنے کا رجحان ہماری کلاسیکی شاعری کا رجحان نہیں۔ میری مراد یہ ہے کہ وہاں یہ بات بھی مروّج مفروضات میں داخل ہے کہ غزل کا مرکزی کردار، یعنی عاشق، رسوم شکن اور مقبول اقدار کو مسترد کرنے والا شخص ہوتا ہے۔ اس کے مقابل ناصح، رقیب، ہم نشیں، زاہد، شیخ وغیرہ ہیں جو مروّج اقدار و رسوم کے حامی اور ان کو قائم کرنے والوں کے معاون ہیں۔ یعنی کلاسیکی غزل کی شعریات میں مرکزی کردار شروع ہی سے اور اپنی اصل ہی کے اعتبار سے Subversive صفات کا حامل ہوتا ہے۔ آج کل کے وہ مغربی نقاد جو خود کو Cultural Materialist یا New Historicist کہتے ہیں، ان کے لیے کلاسیکی غزل کی دنیا بے حد دلچسپ اور حیران کن ثابت ہوگی۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ ادب اگرچہ ہر زمانے میں حاکم طبقے کے اقدار کو قائم کرنے کے لیے وجود میں آتا ہے، لیکن ذی ہوش ادیب ان اقدار کو مستحکم کرنے کی ظاہری کوشش کے در پردہ ان اقدار کو Subvert کرنے یا معرضِ سوال میں لانے کا کام کرتا ہے۔ نئے تاریخیت پرستوں سے بہت پہلے میخائل باختن (Mikhail Bakhtin) نے یہ نظریہ Carnivalisation کے نام سے پیش کیا تھا۔ ہمارے یہاں یہ عالم ہے کہ غزل کی دنیا کا مرکزی کردار خود ہی اوّل درجے کا Subversive ہوتا ہے۔ غالب کی انفرادیت اس بات میں ہے کہ وہ اس Subversion کو بھی Subvert کرنے پر تیار رہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ وہ مروّج اقدار سے نامطمئن تھے اور انھیں شک کی نظر سے دیکھتے تھے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اقدار کا یہ Subversion ان کے نزدیک اس کایاپلٹ کا استعارہ تھا جو ہماری تہذیب اور ہمارے تہذیبی شعور میں رونما ہو رہی تھی۔ چنانچہ جہاں میر یہ کہتے ہیں:

ہاتھ دامن میں ترے مارتے جھنجھلا کے نہ ہم
اپنے جامے میں اگر آج گریباں ہوتا

وہاں غالب کہتے ہیں:

عجز و نیاز سے تو نہ آیا وہ راہ پر
دامن کو اس کے آج حریفانہ کھینچیے

میرؔ کے متکلم کا گریبان چاک ہو چکا ہے۔ اس لیے وہ معشوق کے دامن کو اپنا ہدف بناتا ہے۔ اس میں چالاکی ہے، لیکن عاشق اور معشوق دونوں کی جگہ متعین ہے، جب کہ غالب نے دونوں کی جگہ کو Subvert کر دیا ہے۔ اسی طرح غالب یہ کہہ سکتے ہیں کہ معشوق بھی شوخ اور بے باک ہو اور عاشق بھی شوخ و بے باک ہو:

ہے وصل ہجر عالمِ تمکین و ضبط میں
معشوق شوخ و عاشق دیوانہ چاہیے
اس لب سے مل ہی جائے گا بوسہ کبھی تو ہاں
شوقِ فضول و جرأتِ رندانہ چاہیے

اس کے بجائے کہ عاشق اپنی رسوائی کے سامان کرنے میں خود طاق ہو، غالب اس کے مقام کو منہدم کر کے معشوق کو یہ کام سونپنا چاہتے ہیں:

اپنی رسوائی میں کیا چلتی ہے سعی
یار ہی ہنگامہ آرا چاہیے

اسی طرح، نہ صرف یہ کہ معشوق کا حسن محض مصنوعی ہے:

پوچھ مت رسوائی اندازِ استغنائے حسن
دست مرہونِ حنا رخسار رہنِ غازہ تھا

بلکہ معشوق کی وفا بھی محض اتفاق پر مبنی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ رونے دھونے سے خدایا معشوق مہربان ہو جائے:

وفا سے دلبراں ہے اتفاق ورنہ اسے ہمدم
اثر فریاد دل ہائے حزیں کا کس نے دیکھا ہے

مروج اقدار کو منہدم کرنے یا معرضِ سوال میں لانے کے رجحان کی بنا پر غالب کے

کلام میں ایک طرح کی شوخی، ایک طرح کی Irreverence اور تھوڑی سی کلبیت ہے جو بیسویں صدی کے ذہن کو برانگیخت کرتی ہے، کیوں کہ اسے اس میں خود اپنی کش مکش، اپنے شکوک اور اپنے Dilemmas کا عکس نظر آتا ہے۔ میں چند اشعار مزید نقل کرتا ہوں۔ ان میں سے ہر ایک شعر کسی نہ کسی مروّج یا مقبول مضمون کے برعکس مضمون پر مبنی ہے:

فکرِ سخن یک انشا زندانی خموشی
دودِ چراغ گویا زنجیر بے صدا ہے
سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ الفتِ ہستی
عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا
کوئی آگاہ نہیں باطن ہم دیگر سے
ہے ہر اک فرد جہاں میں ورقِ ناخواندہ
مجھ کو دیارِ غیر میں مارا وطن سے دور
رکھ لی مرے خدا نے میری بے کسی کی شرم
کیا نے ترکِ دنیا کاہلی سے
ہمیں حاصل نہیں بے حاصلی سے
خدا یعنی پدر سے مہرباں تر
پھرے ہم دربدر ناقابلی سے
کچھ نہ کی اپنے جنونِ نارسا نے ورنہ یاں
ذرّہ ذرّہ روکشِ خورشیدِ عالم تاب تھا
کیا وہ نمرود کی خدائی تھی
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا
وفا مقابل و دعوائے عشق بے بنیاد
جنون ساختہ و فصلِ گل قیامت ہے

جی ہی میں کچھ نہیں ہے ہمارے وگرنہ ہم
سر جائے یا رہے نہ رہیں پر کہے بغیر
اپنا نہیں وہ شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں
اس در پہ نہیں یار تو کعبے ہی کو ہو آئے
لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
جانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے
تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں
تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے
ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخی فرشتہ ہماری جناب میں
پوچھا اگرچہ یار نے احوالِ دل مگر
کس کو دماغ منتِ گفت و شنود تھا
تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسد
سرگشتہ خمار رسوم و قیود تھا
بے خودی بے سبب نہیں غالب
کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے
منتا ہے فوتِ فرصتِ ہستی کا غم کوئی
عمر عزیز صرفِ عبادت ہی کیوں نہ ہو
بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے اور یاں
طاقت بقدرِ لذتِ آزار بھی نہیں

یہ اشعار میں نے بے تکلف حافظے سے نقل کیے ہیں، ورنہ اس طرح کے شعر دیوان کے ہر صفحے پر مل جائیں گے۔ ان اشعار میں فنی خوبیاں اور معنی کی گہرائیاں بھی ہیں۔ لیکن فی الحال

یہ اس لیے توجہ طلب ہیں کہ ان میں جو نظریہؑ کائنات نظر آتا ہے وہ ہند اسلامی تہذیب کے نظریہؑ کائنات کی مکمل توثیق نہیں کرتا، بلکہ اس سے ایک حد تک منحرف ہے۔ حالی نے اس بات کو یوں کہا تھا کہ غالب ہر چیز میں اپنی روش الگ رکھنا پسند کرتے تھے۔ بات بڑی حد تک صحیح ہے، لیکن جو سوال غور طلب ہے وہ یہ ہے کہ اپنی روش الگ رکھنے کا یہ ہی طریقہ کیوں؟ مومن بھی بہت بڑے انفرادیت پرست تھے اور ان کے کلام کی روش بھی اوروں سے بہت مختلف ہے۔ لیکن مومن کی دنیا سراسر وہ دنیا ہے جو رسمی طور پر انھوں نے ورثے میں پائی تھی۔

مومن اس دنیا کو کسی شک یا خوف کی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔ اس کے برخلاف غالب کا یہ عالم ہے کہ زمانہ نوجوانی ہی میں وہ خدا کو باپ سے مہربان تر بتاتے ہوئے اپنی آوارہ گردی کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ یہ نا قابلی تھی۔ یعنی وہ خود نا قابل (نالائق) تھے، یا پھر خدا نے ان کو قبول نہ کیا، اگرچہ وہ پدر سے مہربان تر تھا۔

کلام غالب اور نئی نشانیات

غالب کے بارے میں اکثر کہا گیا ہے کہ وہ شروع میں بیدل سے متاثر تھے۔ خود غالب نے اپنے اوائلی کلام میں بیدل کو انتہائی بار خراج عقیدت پیش کیا ہے کہ بیدل کو ان کا معنوی استاد کہا جا سکتا ہے۔ لیکن شروع کے غالب پر ناسخ کا بھی اثر بہت تھا۔ ناسخ کی شہرت کا ستارہ ان دنوں گردش میں ہے اس لیے ہم لوگ غالب پر ناسخ کے اثر کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ واقع یہ ہے کہ دونوں کی شاعری کا بڑا حصہ (اور غالب کا تقریباً سارا غیر متداول کلام) خیال بندی پر مبنی ہے۔ اعظم الدولہ سرور نے "عمدۂ منتخبہ" میں غالب کا ذکر اُس زمانے میں لکھا تھا جب غالب بہت نوعمر تھے۔ سرور نے غالب کو خیال بندی کا شائق بیان کیا ہے۔ خیال بندی کی بنیادی صفت یہ ہے کہ مضمون کی ندرت اوّل ہے، چاہے مضمون خود بہت خوب صورت یا مروّج معیار کا پابند نہ ہو۔ غالب نے خیال بندی والے مضامین میں عقلی استعارے بہت

برتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام ناسخ سے بہت زیادہ رنگارنگ معلوم ہوتا ہے۔ عقلی استعارے اور نشانیات کے تعلق پر مختصر بحث کر کے میں گفتگو ختم کرتا ہوں۔

نشانیات کا بنیادی اصول ہے کہ کسی شے کو کسی شے کا نمائندہ نہیں بلکہ کسی شے کے برابر ٹھہرا لیا جائے۔ استعارہ اپنی اصل شکل میں اس شے کا نمائندہ ہوتا ہے جس کو اس کا مستعارمنہٗ کہتے ہیں۔ مثلاً یہ استعارہ ہے "زید شیر ہے" لیکن اگر ہم یہ کہیں کہ "شیر زید ہے"، یعنی جہاں جہاں "شیر" درج یا مرقوم ہو، ہم وہاں زید فرض کریں تو یہ نشانیاتی عمل ہے۔ عقلی استعارے میں نشانیات کا اصول اکثر کارفرما رہتا ہے۔ غالب نے اس کے ذریعے پھر وہی کام لیا ہے کہ مروج مفروضات کو پلٹنے کی کوشش کی ہے۔ مثال کے طور پر میر:

صبح چمن میں اس کو کہیں تکلیف ہوا لے آئی تھی
رخ سے گل کو مول لیا قامت سے سرو غلام کیا

یہاں معشوق کا باغ میں جانا روزمرہ کی دنیا کا عمل ہے۔ باغ میں اس کا گلاب کے پھول اور سرو کو غلام بنالینا استعاراتی عمل ہے (یعنی گلاب کا پھول اس کے چہرے کا غلام ہے اور سرو کا پیڑ اس کی قامت کا غلام ہے۔ یعنی معشوق کے چہرے اور گلاب کے پھول، اس کی قامت اور سرو کے درخت، میں وہی رشتہ ہے جو مالک اور غلام میں ہوتا ہے۔ مالک = اعلیٰ، غلام = ادنیٰ) لہٰذا میر کے بہ ظاہر سادہ سے مصرعے میں کئی استعارے ہیں لیکن ان کی بنیاد حسیاتی ہے۔ لہٰذا ان کا تجزیہ ہو سکتا ہے۔ اب غالب کے شعر دیکھیے:

ہو اے سیر گل آئینۂ بے مہری قاتل
کہ اندازِ بخوں غلطیدنِ بسمل پسند آیا
اُنھیں منظور اپنے زخمیوں کا دیکھ آنا تھا
اُٹھے تھے سیر گل کو دیکھنا شوخی بہانے کی

سطحی طور پر ان دونوں شعروں میں صورت حال وہی ہے جو میر کے یہاں ہے۔ یعنی معشوق کا باغ کی سیر کو جانا۔ لیکن داخلی طور پر ان میں بنیادی اختلافات ہیں۔ تصور کائنات کی

سطح پر فرق یہ ہے کہ یہاں ہر چیز کا مرتبہ اور مقام متعین ہے۔ ا۔ معشوق کو ہوا نے تکلیف (= ترغیب) دی۔ یہ بات پہلے سے طے ہے کہ غیر لوگ (مثلاً رقیب، یا وہ جو عاشق کے The Other ہیں) معشوق کو ترغیب دیتے ہیں۔ ۲۔ معشوق کا حسن و قامت گل و سرو کے قامت سے کہیں بہتر ہے۔ ۳۔ مظاہر قدرت بھی معشوق پر عاشق ہوتے ہیں۔ غالب کے یہاں تصور کائنات مختلف ہے، کیوں کہ دونوں شعروں میں معشوق بالارادہ سیر باغ کو نکلا ہے۔ یعنی وہ کسی غیر کی ترغیب کا محتاج نہیں ہے۔

استعاراتی طور پر غالب کے شعروں میں بنیادی بات یہ ہے کہ ان کے استعارے Semiotics کے عالم سے ہیں۔ یعنی یہاں بعض چیزیں بعض اور چیزوں کے برابر ہیں، ان کی نمائندہ نہیں ہیں۔ حسب ذیل نقشوں پر غور کیجیے۔

پہلا شعر:

معشوق کی بے مہری اور سنگ دلی

↖ ↓ ↖ ↙

معشوق ← ہوائے سیر گل ↔ بے مہری قاتل

↓ ↓

بخوں انداز غلطیدن بسمل
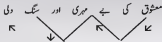
یعنی معشوق کا فعل = ہوائے سیر گل

ہوائے سیر گل ↔ بے مہری قاتل

بے مہری قاتل ↔ پسندیدگی انداز بخوں غلطیدن بسمل

بسمل ↔ گل

(اس نشان (←) سے عمل مراد ہے اور اس نشان (↔) باہم دگر برابری مراد ہے۔)

دوسرا شعر:

معشوق کی شوخی اور سنگ دلی

↖ ↖ ↙

معشوق ← اُٹھے تھے سیر گل کو ↔ شوخی بہانے کی

↘ ↓

زخمیوں کا دیکھ آنا

↙ گل
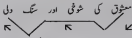
یعنی: معشوق کا فعل = شوخی اور سنگ دلی
شوخی ↔ زخمیوں کا دیکھ آنا ↔ سیر گل
گل ↔ زخمی

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ غالب کے دونوں اشعار میں نشانیات کا نظام Semiotic System کارفرما ہے۔ استعارہ اپنی جگہ پر موجود ہے (اور اس سے ہم معنی بھی متخرج کر سکتے ہیں) لیکن نشانیات کا وہ نظام استعارے کا پہلو بہ پہلو اور مساوی سطح پر قائم ہو جاتا ہے۔ اس نظام میں (یعنی ان دو شعروں کے نشانیاتی نظام میں) جو وضعیں Structures ہیں سب ایک دوسرے کے برابر ہیں اور ایک دوسرے کی جگہ لے سکتے ہیں۔ مستعارلہٗ اور مستعارمنہٗ میں برابری کا رشتہ نہیں ہوتا۔ یعنی جس چیز سے استعارہ کرتے ہیں وہ اس شے سے بڑی ہوتی ہے جس کے لیے استعارہ کیا جاتا ہے۔ یعنی "زید شیر ہے" میں زید کی قوت بہر حال شیر سے کم ہو گی۔ مثلاً اگر بہادری کے لیے استعارہ لانا ہے تو یہ کہنا بے معنی ہے کہ "زید گھڑیال ہے"، کیوں کہ گھڑیال کی شہرت اس کی شجاعت کے باعث نہیں۔ حالانکہ وہ نہایت قوت مند جانور ہے۔ یہاں لامحالہ "زید شیر ہے" یا "زید جنگی ہاتھی ہے" وغیرہ کہنا ہو گا۔ اس اصول کی روشنی میں حسب ذیل شعر ملاحظہ ہو:

ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام
مہر گردوں ہے چراغِ رہگزارِ بادیاں

اس شعر میں مہر گردوں = چراغ رہگزار باد اور چراغ رہگزار باد = مہر گردوں قرار دیا ہے۔ ان کا استعاراتی تعلق اتنا اہم نہیں ہے جتنا اہم ان کا نشانیاتی ربط ہے۔ یعنی جہاں جہاں چراغ رہگزار باد دیکھو اسے مہر گردوں [کی طرح زوال آمادہ] سمجھو۔ چراغ رہگزار باد گویا Sign ہے اور مہر گردوں اس کا Signant دوسری طرف، جہاں جہاں اور جب مہر گردوں کو دیکھو اس کا تصور کرو، اس کو چراغ رہگزار باد [کی طرح زوال آمادہ] سمجھو۔ اس شعر کی قوت Sign اور Signant کی نشانیاتی مساوات میں ہے، جب کہ استعارہ اپنے مستعار لۂ کا Signifier (مدلول) نہیں ہوتا۔ مستعار منہٗ ہمیشہ مستعار لۂ سے افضل اور قوی تر ہوتا ہے۔ نشانیاتی نظام میں Sign اور Signant ایک وحدت قائم کرتے ہیں۔ لہٰذا جب استعارہ اور نشانیاتی نظام ایک ہو جائیں، جیسا کہ اس شعر میں ہے، تو معنی کی توسیع ہی نہیں، بلکہ معنی کا اسرار پیدا ہوتا ہے۔

غالب ہمارے کلاسیکی شاعروں میں واحد شاعر ہیں جن کا مطالعہ اگر خالص مغربی شعریات کی روشنی میں کیا جائے تو بھی وہ بڑی حد تک کامیاب ہوگا، کیوں کہ ان کا ذہن جدید ذہن کے رجحانات کو بار بار Anticipate کرتا ہے اور اگر چہ وہ کائنات کو مشرقی کلاسیکی نظر سے دیکھتے ہیں لیکن جگہ جگہ اس کے بارے میں استفہام بھی کرتے ہیں اور مروج اقدار کو الٹ پلٹ کر دیکھنے کی بھی سعی کرتے ہیں۔ لیکن یہ بات ہمیشہ ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے کہ مشرقی شعریات، مشرقی تہذیب اور مشرقی نظریہ کائنات (World View) سے پوری ہمدردی اور واقفیت کے بغیر غالب کا مطالعہ ممکن نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ غالب ہمارے پہلے بڑے جدید شاعر ہیں اور آخری بڑے کلاسیکی شاعر ہیں۔ غالب کے بارے میں بہت لکھا گیا ہے، لیکن ان کا حق ادا ہونا اس وقت شروع ہوگا جب اُنھیں کلاسیکی اور جدید دونوں تصورات کی روشنی میں بہ یک وقت پڑھا جائے۔

مطالعاتِ غالب، سبکِ ہندی اور پیرویِ مغربی

غالب کے بارے میں دو قصے مشہور ہیں۔ اغلب، بلکہ یقینی ہے کہ دونوں بالکل جھوٹے ہیں۔ لیکن چوں کہ ان سے ہماری تہذیبی روایت، ادبی نظریاتی شعور اور استناد کے اقتدار اور تصور پر روشنی پڑتی ہے۔ لہٰذا اپنی گفتگو انھیں قصوں سے شروع کرتا ہوں۔ پہلا قصہ یہ ہے کہ جب شیفتہ سفرِ حج میں تھے تو ان کی ملاقات ایک ایرانی سے ہوئی۔ شیفتہ چوں کہ فارسی زبان و ادب میں مہارتِ تامہ رکھتے تھے اس لیے ان کی دوستی اس ایرانی سے ہو گئی۔ ایرانی نے ایک بار ان سے پوچھا کہ ان دنوں تمھارے یہاں سب سے اچھا فارسی شاعر کون ہے؟ شیفتہ نے بڑے شوق اور جذبۂ افتخار کے ساتھ دیوانِ غالب نکال کر اسے پیش کیا۔ ایرانی نے اسے ادھر اُدھر سے الٹا پلٹا، چند شعر پڑھے، پھر منہ بنا کر یہ کہتے ہوئے واپس کر دیا کہ یہ شاعری تو سراسر مہمل اور بے تکی ہے۔ نہ زبان درست ہے نہ مضمون کا پتہ۔ شیفتہ بے چارے بہت خفیف ہوئے۔ دوسرا قصہ یہ ہے کہ ایک ایرانی نوجوان دلی میں کسی کتاب فروش کے یہاں دیوانِ غالب خریدنے کے لیے گیا۔ (ساری گفتگو فارسی میں ہو رہی تھی۔) دوکان پر اس وقت اتفاق سے غالب بھی موجود تھے۔ کتاب فروش نے کہا کہ دیوانِ غالب تو نہیں لیکن فلاں فلاں (مثلاً صائب، غنی، عرفی) کے دیوان ہیں۔ نوجوان نے کہا "نہیں مجھے صرف غالب کا دیوان درکار ہے، وہ قرمساق خوب کہتا ہے۔" کتاب فروش نے مسکرا کر کہا کہ دیوانِ غالب نہیں، ہاں خود غالب ضرور موجود ہیں اور غالب کی طرف اشارہ کیا۔ وہ نوجوان بے حد اشتیاق کے ساتھ غالب سے ملا، لیکن ذرا شرمندہ بھی تھا کہ میں نے پیار سے سہی،

لیکن غالب کو ان کے سامنے یوں ان جانے میں قرم ساق کہا۔ غالب نے کہا" نہیں میاں۔ آج مجھے سچی تعریف اور قدر دانی ملی ہے۔"

شیفتہ والا واقعہ تو غالب کے کسی مخالف نے گڑھا ہے۔ خاص کر ایسا مخالف جو ان کے دعویٰ فارسی گوئی کا منکر ہو۔ قصے کے فرضی ہونے میں بہر حال کوئی شک نہیں۔ اول تو یہی بات مستبعد ہے کہ کسی ایرانی ملاقاتی نے شیفتہ جیسے شخص سے ایسی توہین آمیز گفتگو کی ہو۔ اور اگر ایسی بات کسی نے کہی بھی تو شیفتہ کوئی معمولی شخص نہ تھے، وہ فارسی کے عالم اور علوم متداولہ سے خوب واقف تھے۔ غالب تو اپنے دیوان میں غزل ہی درج نہ کرتے تھے جو شیفتہ کو پسند نہ ہو:

غالب بہ فن گفتگو نازد بدیں ارزش کہ او
ننوشت در دیوان غزل تا مصطفےٰ خاں خوش نہ کرد

شیفتہ کے لیے قطعی ممکن تھا کہ وہ اس ایرانی کو سخت جواب دیتے اور قائل معقول کرنے کی کوشش کرتے۔ رہا دوسرا قصہ تو وہ یقیناً شیفتہ والے قصے کے جواب میں گڑھا گیا ہے۔ غالب کے بارے میں ہم جانتے ہیں کہ وہ کتاب خریدتے ہی نہ تھے، چہ جائے کہ کسی کتاب فروش (اگر کتاب فروشوں کی دکانیں اس زمانے میں ہوتی تھیں) کی دکان پر جا کر بیٹھے رہیں۔

قصے دونوں فرضی سہی، لیکن قصے بلاوجہ نہیں بنتے یا بنائے جاتے۔ کسی تہذیب میں جو قصے اور لطیفے اور حکایات متداول ہوتے ہیں، وہ اس تہذیب کے تصور کائنات، غلط اور صحیح کے بارے میں اس کے معیارات، اور اس کے معاشرتی ثقافتی اقدار کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ (مثلاً اگر معاشرے پر عورتوں کا تسلط ہو تو بیوی کی حماقت مآبی، اسراف بے جا، ضد اور متلون مزاجی کے لطیفے اس قدر عام نہ ہوتے اور مغربی معاشرے میں سب سے مقبول لطیفے بیوی کی والدہ کے خلاف نہ ہوتے۔ غالب کے بارے میں ان قصوں کے ذریعے ہم انیسویں صدی کے بدلتے ہوئے تہذیبی اور ثقافتی منظر نامے کے بارے میں بعض اہم نتائج نکال سکتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ ہندوستانی فارسی گو بذات خود مستند نہیں۔ اگر ایرانی کہہ دے کہ ہندوستانی فارسی گو کا کلام مجھے مطبوع طبع نہیں تو ہندوستانی فارسی گو کی وقعت صفر ہو جائے گی اور اگر ہندوستانی فارسی گو کو استناد حاصل کرنا ہے تو اسے ایرانی ہی سے رجوع کرنا ہوگا۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ بدر چاچ (وفات ۱۳۴۴ع) سے لے کر غالب (وفات ۱۸۶۹ع) تک کی مشق سخن گوئی اور ادبی روایت جو کوئی چھ سو برس کے عرصے کو محیط تھی۔ ہندوستانی شاعر کو وہ اعتبار نہ دلا سکی جو ایرانی کو از خود حاصل تھا۔ یعنی اقتدار و استناد ایران کا حصہ تھا اور محکومی و بے اعتباری ہندوستان کا مقدر تھی۔ اس بات سے کوئی غرض نہ تھی کہ غالب شاعر کس درجے کے اور کس مہارت کے تھے۔ غرض اس بات سے تھی کہ ایرانی ان کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔ اسی سے یہ دوسرا نکتہ بھی نکلتا ہے کہ ہندی مزاج (چاہے وہ ہندوستانی مسلمان کا ہی مزاج کیوں نہ ہو) اور ایرانی مزاج میں کچھ ایسا بعد المشرقین ہے کہ ایرانی (چاہے وہ یہودی المذہب کیوں نہ ہو) فارسی شاعری کا حق ادا کر سکتا ہے، لیکن ہندوستانی اس سے قاصر رہے گا۔ تیسرا نکتہ یہ نکلتا ہے کہ ہندوستانی اگر دو لسان (Bilingual) بھی ہو (یعنی اردو اور فارسی دونوں زبانیں مادری زبان کی طرح سمجھتا ہو، نہ کہ ایسا شخص جو فارسی کا محض کتابی ماہر ہو)، فارسی محاورے اور زبان کو "اہل زبان" کی طرح نہیں برت سکتا اور سب سے بڑی بات یہ کہ ہندوستانی چاہے ساری عمر فارسی پڑھنے لکھنے بولنے میں لگادے، لیکن وہ فارسی میں ایسے تصرفات کا حق نہیں رکھتا جو "اہل زبان" ایرانی بچے بھی روز و شب عمل میں لایا کرتے ہیں۔

اس طرح کے عقائد کا انجام یہ ہوا کہ خود ہندوستانیوں کی نظر میں بیدل، غالب اور اقبال جیسے بڑے شاعروں کی فارسی پایۂ ثبوت سے ساقط قرار پائی۔ "شعر العجم" جیسی اقتدار وار کتاب میں بیدل کا صرف نام ایک دو جگہ آیا ہے۔ غالب تو اتنے کے بھی مستحق نہ ٹھہرے۔ واقف اور غنیمت اور بیغم اور برہمن وغیرہ کا تو پوچھنا ہی کیا ہے۔

عام طور پر لوگوں کا خیال ہے کہ مندرجہ بالا رویے اور صورت حالات ہندوستان میں بہت قدیم ہیں۔ لیکن در حقیقت معاملہ بالکل مختلف ہے۔ خود ایرانی حضرات کی نظر میں ہندوستانی فارسی گویوں کی کوئی وقعت نہ ہو (وہ لوگ تو خسرو تک کی زبان میں کیڑے نکالتے ہیں جن کے بارے میں غالب کا فیصلہ تھا کہ اہل ہند میں امیر خسرو کے سوا کوئی مسلم الثبوت نہیں۔ میاں فیضی کی بھی کہیں کہیں ٹھیک نکل جاتی ہے۔ (ٹھیک نکل جانا = بات غلط ہو جانا۔) لیکن اہل ہند اپنے بارے میں مطمئن تھے کہ فارسی زبان و ادب پر وہ بالکل اہل ایران کی طرح متصرف ہیں اور خان خاناں، بیدل، غنیمت، واقف، فیضی، ناصر علی سرہندی، خان آرزو،

آزاد بلگرامی وغیرہ بھی اسی طرح مستند اور "درست" ہیں جس طرح حافظ، رومی، سعدی اور ان کے بعد کے سبک ہندی والے ایرانی اساتذہ درست ہیں۔ اٹھارویں صدی میں یہ خیال عام تھا کہ ہندوستانی نژاد فارسی گو اور ایرانی نژاد ہندوستانی فارسی گو (جیسے بیدل، میرزا مظہر، برہمن، ناصر علی، ظہوری، ملک قمی، نوعی، آشنا، خالص، فیضی، سعیدائے اشرف، نعمت خاں عالی، غنی) سب کے سب معتبر اور معتمد ہیں اور ان کا استعمال سند ہے۔ خان آرزو نے اس سے بڑھ کر یہ کیا کہ ایرانی نژاد لغت نگاروں مثلاً محمد حسین تبریزی صاحب "برہان قاطع"، جمال الدین انجو صاحب "جہاں گیری" اور عبدالرشید الحسینی صاحب "رشیدی" کے لغات مندرجہ بالا کا تنقیدی محاکمہ کیا اور اس طرح یہ ثابت کیا کہ لغت شناسی اور تحقیق الفاظ میں ان ایرانیوں کا درجہ ہندوستانیوں سے کم ہے۔ پھر انھوں نے شیخ علی حزیں کے کلام میں اور جنوں اغلاط نکالے اور اس بحث پر ایک مستقل تصنیف "تنبیہ الغافلین" کے نام سے مرتب کی۔ یہ اور بات کہ خان آرزو کے حریف سیالکوٹی مل وارستہ نے شیخ علی حزیں کے دفاع اور خان آرزو کے رد میں اپنا رسالہ "رجم الشیاطین" لکھا، لیکن وہ ذاتی معاملہ تھا۔ ہندوستانیوں کو مستند قرار دینے میں وارستہ اور خان آرزو ہم خیال تھے اور وارستہ نے اپنے لغت "مصطلحات شعرا" میں متعدد ہندوستانیوں کے کلام سے بے تکلف استناد کیا ہے۔ پھر آنند رام مخلص کی "مرآۃ الاصطلاح" ہے۔ اس کے بارے میں نذیر احمد کا خیال ہے کہ اٹھارویں صدی میں ہندوستانیوں کی لکھی ہوئی کچھ فرہنگیں جن کا جواب اہل ایران آج تک نہ پیش کر سکے، ان میں "مرآۃ الاصطلاح" نمایاں مقام کی مالک ہے۔ سب سے بڑھ کر ٹیک چند بہار کی "بہار عجم" ہے جسے فارسی الفاظ و محاورات کا سب سے بڑا اور مکمل ترین لغت کہا جاسکتا ہے۔ بہار اور وارستہ دونوں نے خان آرزو سے استفادہ بھی کیا ہے اور اختلاف بھی۔ اپنے عظیم الشان لغت میں ٹیک چند بہار نے جگہ جگہ اپنے استاد خیر اللہ مہندس دہلوی کو "خیر المدققین" اور خان آرزو کو "سراج المحققین" کے نام سے یاد کیا ہے۔ علاوہ ازیں بہار نے پرانے ایرانیوں یا ایرانی نژاد لغت رشرح نگاروں سے بھی اپنی تحقیق کے مطابق اختلاف کیا ہے۔

نقد شعر کے میدان میں آیئے تو شمس الدین فقیر کی "حدائق البلاغت" ہے جس میں عروض و بیان اور قافیہ کے بارے میں اجتہادی باتیں ہیں۔ سودا کا رسالہ "عبرت الغافلین"

ہے جس میں اُنھوں نے فاخر مکین کے جواب میں ہندوستانی اور ایرانی شعر اکا دفاع کیا ہے اور مکین کے اعتراضات کو بخوبی رد کیا ہے۔ انشااور قتیل کی "دریائے لطافت" ہے جس کو لسانیات پر اردو کی اولین کتاب کہا جاسکتا ہے اور جس میں علم بیان پر بھی گفتگو ہے۔ تحقیق کے میدان میں سرب سکھ دیوانہ جیسے جگت استاد ہیں۔ سودا ہیں جو اردو فارسی میں دولسان ہیں۔ میر ہیں جو فارسی کے عمدہ شاعر اور اعلیٰ درجے کے فارسی نثر نگار بھی ہیں۔ بھوپت رائے بیغم بیراگی ہیں جنھوں نے ویدانت کے مسائل کو مثنوی روی کے طرز پر ایک طویل مثنوی میں بیان کیا۔ محمد افضل سرخوش اور آزاد بلگرامی اعلیٰ درجے کے تذکرہ نگار اور غیر معمولی شاعر ہیں۔ خود بیدل ہیں اور پھر ان کے شاگردوں میں بندرابن خوشگو، اچل داس اور سکھراج سبقت ہیں۔ غرض کہ اٹھارویں صدی کے بارے میں ہمارے کتابی مورخ کچھ بھی کہیں، لیکن فارسی زبان وادب کے اعتبار سے یہ صدی ہندوستانی خوداعتادی کے قائم ہونے اور ہندوستان میں فارسی زبان شناسی، لغت نگاری اور فارسی میں تحقیقی کام کے سن بلوغ کو پہنچنے کی صدی ہے۔

تحقیق، تخلیق اور خوداعتادی کے اس جوش کے بعد انیسویں صدی کے ہندوستانی فارسی حلقوں میں اعتماد کی کمی، ہندوستانی فارسی گویوں کی ناقدری اور فارسی کے عمومی زوال کی صورت عبرت انگیز اور حیرت خیز ہے۔ فارسی زبان و دراسات زوال کی ایک وجہ تو انگریز قرار دیے جاسکتے ہیں جنھوں نے ۱۸۳۵ء میں فارسی کو سرکاری زبان کے مرتبے سے ہٹادیا۔ لیکن ہندوستانی فارسی کے بارے میں رائے کی آب و ہوا میں تبدیلی کے لیے وجوہ تلاش کرنا آسان نہیں۔

ایک حد تک تو خود غالب اس کے ذمہ دار ٹھہرائے جاسکتے ہیں۔ اوائل عمر سے لے کر ۱۸۲۸ء/ ۱۸۲۹ء تک وہ بیدل کی گرویدگی کا اعلان بار بار کرتے رہے، اردو میں زیادہ اور فارسی میں کم۔ لیکن فارسی میں عملاً اُنھوں نے بیدل پرستی کا اظہار یوں کیا کہ بیدل کی غزلوں پر غزلیں لکھیں۔ اپنی مثنوی "چراغ دیر" اُنھوں نے صاف صاف بیدل کے تتبع میں لکھی اور غالباً ملا سابق بنارسی کی مثنوی "تاثیر عشق" بھی ان کے سامنے تھی۔ (ملا سابق بنارسی دیار امصار مشرق کے مشہور استاد، فارسی گو اور شیخ علی حزیں کے دوستوں میں تھے۔) محفوظ

رہے کہ "چراغ دیر" یا تو بنارس کے زمانۂ قیام کی یادگار ہے، یعنی جب غالب کلکتہ جاتے ہوئے بنارس میں ٹھہرے تھے، یا پھر کلکتہ میں اپنی آمد کے فوراً بعد اُنھوں نے یہ مثنوی لکھی۔ ہندوستانی فارسی گویوں سے غالب کی عقیدت کے مبدل بہ نفرت واستحقار ہونے کی وجہ مرزا قتیل تھے جن کی سند پر ایک صاحب نے غالب کے شعر میں "ہمہ عالم" کی ترکیب کو غلط ٹھہرایا تھا:

جزوے از عالمم و از ہمہ عالم بیشم
ہم چو موے کہ بتاں را زمیاں برخیزد

غالب نے کسی بنا پر محض قتیل سے انکار کرنا ٹھیک نہ سمجھا اور مصلحت اسی میں جانی کہ تمام ہندوستانی فارسی گویوں کے منکر ہو جائیں۔ ممکن ہے محفل میں (یا کلکتہ میں) قتیل کے ماننے والوں کی تعداد بہت کثیر دیکھ کر غالب نے محض قتیل کو اپنے انکار کا ہدف بنانا خلاف احتیاط سمجھا ہو۔ بہر حال مثنوی "باد مخالف" میں پھر بھی وہ بیدل کا لحاظ کر گئے اور ان کو واقف اور قتیل کے ساتھ نہ رکھا:

ہم چناں آں محیط بے ساحل
قلزم فیض، میرزا بیدل

☆☆☆

گرچہ بیدل ز اہل ایراں نیست
لیک ہم چوں قتیل ناداں نیست

☆☆☆

مگر آناں کہ پارسی دانند
ہم بریں عہد و رای و پیانند
کہ ز اہل زباں نبود قتیل
ہرگز از اصفہاں نبود قتیل
لاجرم اعتماد را نسزد
گفتہ اش استناد را نسزد

سخن است آشکار و پنہاں نیست
دہلی و لکھنؤ ز ایراں نیست
☆☆☆
اے تماشائیانِ ژرف نگاہ
ہاں بگوئید حسبۃً للّٰلہ
کہ چاں از حزیں بہ ہیچم سر
آہ بہ جادو دمی بہ دہر سر
☆☆☆
دامن از کف کنم چگو نہ رہا
طالب و عرفی و نظیری را
خاصہ روح و روانِ معنی را
آں ظہوری جہانِ معنی را
☆☆☆
آں کہ طے کردہ ایں مواقف را
چہ شناسد قتیل و واقف را

غالب نے یہاں تو بیدل کو رعایتی نمبر دے کر پاس کر دیا اور باقی ہندوستانیوں کو صاف راستہ بتادیا کہ دہلی اور لکھنؤ "ز ایراں نیست" لیکن بیدل کو قائم رکھنا اور باقی ہندوستانیوں کو ساقط رکھنا خلاف عقل تھا، لہٰذا اُنھوں نے اس مثنوی کے بعد کہیں نظم و نثر میں بیدل کی تعریف نہ کی۔ اپنے خطوط میں ایک آدھ بار بیدل کے شعر اُنھوں نے ضرور نقل کیے، لیکن ان کی فارسی کو مستند نہ مانا۔ مارچ / اپریل ۱۸۵۹ء کے ایک خط میں عبدالغفور سرور کو لکھتے ہیں: "ناصر علی اور بیدل اور غنیمت ان کی فارسی کیا۔ ہر ایک کا کلام بہ نظر انصاف دیکھیے ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔" رہے ہندوستانی لغت نویس یا ایرانی نثر اور ہندوستانی لغت نویس، تو ان کے بارے میں غالب نے کچھ بھی نہ لگا رکھی۔ وہ تو صائب تک بعض اوقات اس بنا پر مسترد کر دیتے ہیں کہ "صائب اگر چہ اصفہانی نژاد تھا مگر وارد شاہ جہاں آباد تھا، انتقام کشیدن و انتقام

گر فتن وونوں بول گیا۔" (ایضاً بنام عبدالغفور۔) "دارستہ سیالکوٹی نے خان آرزو کی تحقیق پر سو جگہ اعتراض کیا ہے اور ہر اعتراض بجا ہے۔ بایں ہمہ وہ بھی جہاں اپنے قیاس پر جاتا ہے، منہ کی کھاتا ہے۔" (ایضاً بنام عبدالغفور۔) پھر لکھتے ہیں: "فرہنگ لکھنے والوں کا مدار قیاس پر ہے، جو اپنے نزدیک صحیح سمجھا، وہ لکھ دیا۔ نظامی وسعدی وغیرہ کی لکھی ہوئی تو فرہنگ ہو تو ہم اس کو مانیں۔ ہندیوں کو کیوں کر مسلم الثبوت مانیں۔" (بنام تفتہ مورخہ ۱۴ مئی ۱۸۶۵ء) اس کے باوجود جہاں انھیں من مانی کرنا ہوتی ہے، وہاں غالب ایرانیوں کو بھی نہیں بخشتے۔ صائب کا حال ہم اوپر لکھ چکے ہیں۔ "بے پیر" کے بارے میں تفتہ کو لکھتے ہیں (قبل ۱۸۶۳ء): "لفظ بے پیر تو رانی بچہ ہائے ہندی نژاد کا تراشا ہوا ہے — مرزا جلال اسیر علیہ الرحمۃ مختار ہیں اور ان کا کلام سند ہے۔ میری کیا مجال ہے کہ ان کے باندھے ہوئے لفظ کو غلط کہوں۔ لیکن تعجب ہے اور بہت تعجب ہے کہ امیر زادہ ایران ایسا لفظ لکھے۔" یعنی "امیر زادۂ ایران" کو بھی یہ حق نہیں کہ کسی ایسے لفظ کو برت لے جو ہندیوں نے تراشا ہو۔ ہندیوں کا تراشا ہوا لفظ یا فقرہ گندہ ہی ہوگا۔ زبان کے حرکی عمل سے بے خبری جو غالب کے اس بیان سے مترشح ہے، اس پر مزید گفتگو بے کار ہے۔ اتنا کہنا کافی ہے کہ وہ اہلِ زبان ہی کیا جو ضرورت اور موقعے کے لحاظ سے الفاظ یا فقرے نہ وضع کر سکے یا دوسروں کے وضع کیے ہوئے الفاظ یا فقروں کو استعمال کرنے سے قاصر رہے؟

ایک دو اقتباسات اور ملاحظہ ہوں۔ (بنام تفتہ مورخہ ۱۴ اکتوبر ۱۸۶۱ء): "میں "برہان" کا خاکہ اُڑا رہا ہوں۔ "چار شربت" اور "غیاث اللغات" کو حیض کا لتا سمجھتا ہوں۔" (بنام مرزا رحیم بیگ) "یہ کیا بات ہے کہ جامع "برہان" کا ماخذ فرہنگ رشیدی و جہاں گیری ہے۔ عبدالرشید کی کیا شیخی اور میاں انجو میں کیا پیری ہے؟ قطب شاہ و جہاں گیر کے عہد میں ہوتا اگر منشائے برتری ہے تو بے چارہ جعفر زٹلی بھی فرخ سیری ہے۔" پھر "برہان قاطع" کے قضیے میں اُنھوں نے مسلسل اس بات کا اعادہ کیا کہ اہلِ ہند کی فارسی بے وقعت ہے (اور ظاہر ہے کہ "اہلِ ہند" سے ان کی مراد وہ لوگ بھی تھے جو ایرانی الاصل تھے لیکن ہندوستان میں آ بسے گئے تھے اور جنھوں نے فارسی زبان کی بعض بہت قابلِ قدر فرہنگیں مرتب کی تھیں۔ مثلاً محمد حسین تبریزی، جمال الدین انجو شیرازی اور عبدالرشید الحسینی المدنی التتوی (۱)

(۱) تتوی = ٹھٹھہ (سندھ) کا رہنے والا۔

"قاطع برہان" کے رد میں سب سے مفصل اور مقتدر کتاب جو لکھی گئی وہ آغا احمد علی کی "موید برہان" (۱۸۶۶) تھی۔ چار سو سے زیادہ صفحات کی اس کتاب کے جواب میں غالب نے رسالہ "تیغ تیز" لکھا جو بہ مشکل ساٹھ صفحے کا ہے۔ اس میں مصطفیٰ خاں شیفتہ اور حالی جیسے شاگردوں اور نیاز مندوں کے بعض اقوال بھی از روئے فتوی درج کیے۔ یعنی ایک طرف تو خان آرزو کو غیر مستند کہا جا رہا ہے۔ جمال الدین انجو اور محمد حسین تبریزی کو پایۂ اعتبار سے ساقط قرار دیا جا رہا ہے۔ اور اسی سانس میں خود اپنے شاگردوں اور نیاز مندوں کا قول بطور سند پیش کیا جا رہا ہے۔ اس طرح کے تضادات اور اغلاط کے باوجود غالب ہی کی بات چلی اور احمد علی کے اعتراضات اور استدراکات بے حقیقت رہے۔ یعنی ہندوستانیوں نے اپنی جڑ آپ ہی کاٹ دی اور اپنی ہی زبان سے خود کو غیر مستند اور غیر معتبر قرار دے لیا۔ آغا احمد علی کی کتاب کا اثر، بلکہ نام تک، نہ پھیلنے کی ایک وجہ حالی کا بیان بھی ہے۔ "یادگار غالب" میں حالی نے اس بات کا ذکر بالکل نہ کیا کہ غالب نے "تیغ تیز" میں انھیں بھی مفتی بنایا تھا۔ بلکہ اپنے عام مسلک کے خلاف حالی نے تمام مویدین "برہان قاطع" (اور مخالفین غالب) کے بارے میں تحقیری جملہ استعمال کیا: "ہندوستان کے پرانے تعلیم یافتہ جو آج کل ایک نہایت کسمپرسی حالت میں ہیں، ان کے لیے گنج خمول و گمنامی سے نکلنے کا کوئی موقع اس کے سوا باقی نہیں رہا کہ کسی سر بر آوردہ اور ممتاز آدمی کی کتاب کارد لکھیں اور لوگوں پر یہ ظاہر کریں کہ ہم بھی کوئی چیز ہیں۔"

موجودہ معلومات کی روشنی میں یہ کہنا تو مناسب نہ ہوگا کہ انیسویں صدی میں ہندوستانی فارسی گویوں کی اعتبار شکنی، صرف اور صرف غالب کی وجہ سے (یعنی غالب کی رایوں اور فیصلوں کے باعث) عمل میں آئی۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ ۱۸۲۸/۱۸۲۹ سے لے کر ۱۸۶۹ یعنی دم آخر تک غالب نے ہندوستانی فارسی گویوں کو غیر معتبر اور غیر معتمد قرار دینے کی مہم چلائی۔ چالیس برس میں اس کا کچھ نہ کچھ اثر تو یقیناً پیدا ہوگا۔ شبلی کی مثال ہم دیکھ چکے ہیں کہ انھوں نے "شعر العجم" میں غالب اور بیدل کا کوئی ذکر نہ کیا، تا بہ سرخوش و

واقف و سرب سکھ دیوانہ وغیر ہم چہ رسد۔ ایک بار شبلی کو لفظ "انداز" کے بارے میں محقق بات مطلوب تھی، تو ایک صاحب نے انھیں غالب کے ایک شعر کی طرف متوجہ کیا جس میں یہ لفظ آیا تھا۔ شبلی نے جواب میں لکھا کہ غالب کا شعر ان کی نظر میں تھا، لیکن غالب چوں کہ "اہل زبان" نہیں ہیں، اس لیے ان کے استعمال سے تشفی نہیں ہوئی۔ مولانا ضیا احمد بدایونی نے ساہتیہ اکاڈمی کے لیے فارسی شاعری کا ایک انتخاب "سمن زار" کے نام سے مرتب کیا۔ (اول اشاعت ۱۹۶۸) یہ انتخاب اب بھی بہت بااثر اور مقبول ہے۔ اس میں غالب تو ہیں لیکن بیدل، غنی، واقف، میر زا مظہر کسی کا پتہ نہیں۔

شبلی اور غالب کے مقابلے میں ہم اہل لکھنؤ اور اقبال کو پیش کر سکتے ہیں کہ لکھنؤ والوں (بلکہ عام اردو والوں) کو اقبال کو مستند ماننے میں ہمیشہ تامل رہا ہے۔ سرور صاحب نے مجھ سے بیان کیا کہ ایک بار لکھنؤ میں بحث اٹھی کہ "آویزش" بمعنی "جھگڑا، اختلاف" صحیح ہے کہ نہیں۔ سرور صاحب نے فوراً اقبال کا شعر پڑھا ("بال جبریل"، نظم بعنوان "پیر و مرید"):

تا کجا آویزش دین و وطن

جوہر جاں پر مقدم ہے بدن

تو سراج لکھنوی مرحوم نے فرمایا کہ اقبال مستند نہیں ہیں، کسی "اہل زبان" کا شعر سنایئے۔

انگریزوں نے ہندوستان میں فارسی زبان کی تعلیم کو نقصان ضرور پہنچایا، لیکن ہندوستانی فارسی گوئی کی قدر شکنی میں ان کا ہاتھ نہیں نظر آتا۔ بلکہ انگریزوں نے تو ہندوستانی / ایرانی کا فرق بظاہر بالکل نہیں کیا۔ انھوں نے ہندوستانی فارسی گویوں کی شاگردی اختیار کی، انھیں کی طرح شعر گوئی کی۔ ۱۸۰۴ - ۱۸۰۵ میں ہندوستان میں فارسی کا آخری بڑا لغت ("شمس اللغات") ایک انگریز جوزف جینر (Joseph Jenner) کی فرمائش پر بعض ہندوستانی علما نے تیار کیا۔ انیسویں صدی میں "برہان قاطع" کی کم سے کم چار اشاعتیں عمل میں آئیں۔ ان میں سے دو اشاعتیں انگریزوں کے زیر اہتمام تھیں۔ فضل علی نامی ایک شخص نے ۱۸۸۵ میں ایک فارسی انگریزی لغت شائع کیا اور اس کے دیباچے میں لکھا کہ "مہربان برطانوی حکومت" کے زیر سایہ انگریزوں میں فارسی کا ذوق بڑھ رہا ہے، وغیرہ۔ انگریزوں نے فارسی سے انگریزی میں ترجمے کو فروغ دیا۔ یعنی انگریزوں نے ہندوستانی فارسی ادب کو قائم و مقبول

کرنے کے لیے بڑھ چڑھ کر کام نہ کیا ہو، لیکن انھوں نے ہندوستانی فارسی گویوں کو ہندوستانی فارسی ادب کے بارے میں کسی احساس کم تری میں نہ مبتلا کیا۔

بغاوت ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان کی سیاسی صورت حال تھوڑی بہت اور ہندوستان میں انگریزوں کی ثقافتی صورت حال بہت کچھ بدلی۔ اب انگریزوں اور ہندوستانیوں کے مابین ربط کم ہونے لگا۔ ہندوستانی (خاص کر ہند + مسلم) ادب و ثقافت کے خلاف انگریزوں کا تعصب بڑھنے لگا، ہندوستانی طرز معاشرت انگریزوں کی محل سراؤں میں کم سے کم دکھائی دیتے۔ چند ہی برسوں میں بالکل معدوم ہو گیا۔ لیکن اس سب میں کہیں یہ نظر نہیں آتا کہ انگریزوں نے ہندوستانیوں سے کہا ہو کہ تمھارا فارسی شعر و ادب پڑھنے پڑھانے کے قابل نہیں ہے، اصل فارسی تو ایرانیوں کی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ خود ہندوستانیوں کے دل میں اپنے خلاف نفرت اور اپنی اقدار کے بارے میں شک و شبہہ کا دور جو ۱۸۵۷ء کے بعد زور و شور سے شروع ہوا("آب حیات" کو ہند + مسلم Self Hatred کا اچھا نمونہ کہا جا سکتا ہے) اس کی بنا پر ہندوستانیوں کو اپنا فارسی ادب بھی ایرانیوں کے مقابلے میں لچر اور کم وقعت معلوم ہونے لگا ہو تو اور بات ہے۔ تاریخ ہمیں بس اتنا بتاتی ہے کہ فارسی تو فارسی۔ اردو میں بھی فارسی روزمرہ اور اسلوب کی صحت اور درستی کا التزام جو ہمیں اٹھارویں صدی میں بالکل نہیں ملتا۔ انیسویں صدی میں اچانک ہر طرف نظر آنے لگتا ہے۔ لوگ فارسی تراکیب کی سند مانگنا شروع کر دیتے ہیں، اس بات پر بحث کرنے لگتے ہیں کہ فلاں لفظ فارسی میں فلاں معنی میں ہے یا فلاں طرح بولا جاتا ہے۔ اردو میں بھی ایسا ہی ہونا چاہیے۔ عروض اور قافیہ میں جو آزادیاں اٹھارویں صدی میں عام تھیں، انیسویں صدی کے اردو والے انھیں یک قلم ترک کر دیتے ہیں، بلکہ اپنی طرف سے بھی دس بیس پابندیاں عائد کر دیتے ہیں۔ غالب نے لکھا کہ جب کسی مصرعے میں الف گرتا ہے تو میرے سینے پر چھرا سا گرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ حضرت شاہ آسی سکندر پوری (۱۸۳۴ تا ۱۹۱۷ء) اس بات پر فخر کرتے تھے کہ میرے پورے کلام میں کہیں بھی الف دبایا ساقط نہیں ہوا ہے۔ "فارسی" الفاظ میں حرف علت کا سقوط بطور خاص جرم ٹھہرایا جانے لگا۔ میر عشق اور ان کے پیروؤں نے تو "کھاتے ہیں"، "جاتے ہیں"، "کھاتی ہیں"، "جاتی ہیں" وغیرہ فقروں کو بھی بروزن فاعلن لکھنا اپنے اوپر حرام قرار

دے لیا۔

یہ چیزیں کسی کائناتی پیانے کے احساس کم تری اور خود نفرینی کی بنا پر پیدا ہو سکتی ہیں، لیکن خود اس احساس کم تری کا ہندوستانی بہ مقابل ایرانی فارسی کی بحث کا روپ لے لینا پھر بھی سمجھ میں نہیں آتا۔ بہر حال اس کا فوری نتیجہ غالباً یہ ہوا کہ ہندوستانی فارسی گویوں میں سے اکثر کو ترک کر کے چند ایک، خاص کر غالب، پر توجہ ہوئی اس امید میں کہ زبان کے بجائے مضمون اور "فکر" کے پہلوؤں کو آگے بڑھائیں تو شاید غالب کو بین الاقوامی محفلوں میں بار مل سکتا ہے۔ چنانچہ "یادگار غالب" اور "مقدمہ شعر و شاعری" میں کچھ اس قسم کا نظریہ قائم کیا کہ اگر چہ فارسی محاورہ اور لفظیات کے التزام میں غالب کسی ایرانی سے کم نہیں ہیں، بلکہ عام طور پر عرفی، نظیری، ظہوری وغیرہ سے بڑھ کر ہی ہیں، لیکن بنیادی بات یہ ہے کہ:
ا۔ غالب کے یہاں "اصلیت اور جوش" کی فروانی ہے، یعنی ان کی شاعری "سچی" ہے۔ روایتی اردو فارسی شاعری کی طرح "جھوٹ" اور "مبالغہ" پر مبنی نہیں ہے۔ ۲۔ غالب کے یہاں فکر اور "تفحص کائنات" (یہ اصطلاح حالی کی ہے) کا عنصر نمایاں ہے۔ ۳۔ غالب کو روایت کا احترام ہے، لیکن وہ اندھے روایت پرست نہیں ہیں، بلکہ اپنی راہ آپ نکالنا پسند کرتے ہیں۔

یہ تینوں کی تینوں باتیں بیسویں صدی کے شروع میں نقد غالب کا وظیفہ رہیں (اور کتابی تنقید میں آج بھی نمایاں ہیں۔) حالی کی اس بات کو تو کسی نے نہ مانا کہ غالب کی فارسی "اہل زبان" اور ایرانیوں کے ہم پلہ ہے، لیکن ان کی یہ بات، بہت چلی کہ غالب کا تذکرہ مغربی شعرا کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ مغربی طرز تنقید سے غالب کو جانچیں تو غالب کا پلہ ہلکا نظر نہ آئے گا اور غالب کا مطالعہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ "مانا کہ انگلش لٹریچر کی ترقی منتہائے کمال کو پہنچ گئی ہے اور ہمارے لٹریچر نے اسی کی بدولت کچھ عرصے سے آگے قدم بڑھانا شروع کیا ہے۔ مگر جب تک لوگ یہ نہ سمجھیں گے کہ ہم کو انگلش لٹریچر سے کون سی باتیں اخذ کرنی چاہییں اور اپنے قدیم لٹریچر سے کیا سبق لینا چاہیے، اس وقت تک ہمارا لٹریچر اصلی ترقی سے محروم رہے گا۔" ("یادگار غالب، اوّل ایڈیشن ۱۸۹۷ صفحہ ۴۲۸)

بہر طور، حالی نے ہندوستانی فارسی گویوں اور خاص کر غالب کی تنقید کو ایران پرستی کے اس قلاوے سے نجات دلائی جو انیسویں صدی سے اور خود غالب سے، انھیں ورثے میں ملا

تھا۔ ایران کے علی الرغم، اُنھوں نے تنقید اور خاص کر نقد غالب کا رخ مغرب کی طرف پھیر دیا۔ اس کے نتائج بہت جلد سامنے آئے۔ عام طور پر لوگ بجنوری اور حالی میں بڑا بعد زمانی فرض کرتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ "محاسن کلام غالب" (۱۹۲۱) اور "یادگار غالب" (۱۸۹۷) میں پچیس سال کا بھی فرق نہیں۔ اس سے خاصا زیادہ فرق آل احمد سرور کی "نئے اور پرانے چراغ" (۱۹۵۱) اور محمد حسن عسکری کی "جدیدیت، یعنی مغرب کی گمراہیوں کا خاکہ" (۱۹۷۹) میں ہے۔ "بجنوری نے حالی کے اصولوں اور اشاروں پر چلتے ہوئے ایسی تنقید لکھ دی جو بعض اعتبارات سے "یادگار غالب" سے بھی زیادہ بااثر ثابت ہوئی۔ "محاسن" میں حسب ذیل قسم کے جملے قدم قدم پر ملتے ہیں:

> صلاح الدین خدا بخش نے غالب کا مقابلہ ہاٹن رش ہائی (۱) نے المانوی شاعر سے کیا ہے۔ کہاں ہائن رش ہائی نے محض معنی..... کہاں غالب جو دنیا کو اطلس (۲) کی مثال اپنے شانوں پر اٹھائے ہوئے ہے۔ (ص ۳۷)
>
> غالب اور گیٹے دونوں کی ہستی انسانی تصور کی آخری حدود کا پتہ دیتی ہے..... تہذیب، تمدن، تعلیم، تربیت، فطرت کوئی زندگی کا ایسا پہلو نہیں جس پر دونوں کا اثر نہ پڑا ہو۔ (ص ۳۷-۳۸)
>
> شیکسپیر اور غالب کا کام قواعد زبان کی پابندی نہیں ہے۔ یہ قواعد زبان کا کام ہے کہ ان کی پابندی کرے۔ (ص ۴۵)
>
> ططیان (۳) (Titian) کے رنگوں میں بھی وہیں سکون ہے جو اس کی جنبش موقلم میں ہے اور گاگین (۴) (Gaugin) کے رنگوں میں

(۱) تلفظ اور املا بجنوری مرحوم کے مطابق ہیں۔ آج کل اردو میں ہائنرخ ہائنہ مستعمل ہے۔
(۲) Atlas یونانی اسطور میں ایک دیو (Titan) جسے آسماں بردوش رہنے کی سزا ملی تھی۔ پرومیتھیوس Prometheus (جس نے دنیا کو آگ سے روشناس کیا) اس کا بھائی تھا۔
(۳) اصل تلفظ تیشن ہے۔ میں نے بجنوری مرحوم کے تلفظ اور املا کی پابندی کی ہے۔
(۴) اصل تلفظ گوگیں ہے۔ میں نے بجنوری مرحوم کے تلفظ اور املا کی پابندی کی ہے۔

بھی وہی ہیجان ہے جو ارتعاش اس کے تخیل میں ہے۔ مرزا نے خود
آفریدہ تشبیہات اور استعارات کا اس بے تکلف انداز سے استعمال کیا
ہے کہ یہ معلوم ہوتا ہے گویا یہ ہمیشہ سے ہماری زبان میں موجود تھے
اور ہزار بار کے سنے ہوئے ہیں۔(۱) (ص ۷۴)

حالی اور بجنوری کی قائم کردہ غالب کی نئی تنقید سے غالب اور کلاسیکی اردو فارسی شاعری کو جہاں بہت سے نقصان ہوئے، وہاں کئی فائدے بھی ہوئے۔ سب سے پہلا فائدہ تو یہ ہوا کہ غالب کو مغربی شاعر کی طرح پڑھا جانے لگا اور ان کے مواد نے بیدل و عرفی و طالب آملی سے زیادہ گوئٹے، ورڈز ورتھ اور شکسپیر سے ہونے لگے۔ یعنی غالب کو مغربی ایوان میں بٹھا کر دیکھنا ممکن ہو سکا۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ مغربی طالب علموں اور ماہرین کو ہوا جن کے لیے کلاسیکی یا روایتی طرز کا مطالعہ بے سود، یا نا مفہوم یا بہت مشکل تھا۔ پھر یہی بات اردو فارسی کے ہندوستانی طالب علموں اور نقادوں پر صادق آنے لگی۔ یعنی غالب ہمارے لیے ہندوستانی شاعر بھی رہے اور مغربی شاعر بھی بن گئے۔ فلسفہ کلام غالب، غالب کی شاعری میں خودداری، خود پسندی، علو ہمتی، بلند حوصلگی، غالب اور انسان دوستی وغیرہ موضوعات کا چلن ہوا اور غالب کو سمجھنے کے لیے کسی داخلی، اندرونی نظارے Insider's View کی ضرورت نہ رہی۔ بالفاظ دیگر مغربی ماہرین اور علماجن کے لیے غالب کو سمجھنا عام حالات میں بہت مشکل ہوتا، اب غالب کے بارے میں آسانی سے کلام کرنے لگے۔ غالب اور اہل غالب کا اس میں یہ فائدہ تھا کہ غالب کے بارے میں غور و فکر کرنے کے نئے طریقے اور نئے راستے ہاتھ آئے اور غالب کی عظمت کا ایک اور ثبوت ملا۔ پھر لطف یہ کہ اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہ رہی کہ غالب کی کون کون سی تراکیب اور استعارے اور فقرے ایرانی فارسی کے معیار پر کھرے اترتے ہیں۔ عام طور پر ہندوستانی فارسی کو کا بازار تو سرد کا سرد رہا، لیکن غالب کا نرخ ان اجناس کی بنا پر اونچا ٹھہرا جو مغربی طرز کے مطالعے کی بنا پر لوگوں نے ان کے یہاں دریافت کی تھیں۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ حالی اور بجنوری کے بغیر غالب کو وہ شہرت ملی جو انھیں ملی۔ وہ یقیناً اس شہرت، بلکہ اس سے بھی زیادہ کے مستحق ہیں۔

---

(۱) تمام اقتباسات نسخۂ حمیدیہ کے اول (بھوپالی) ایڈیشن ۱۹۲۱ سے لیے گئے ہیں۔

لیکن سوال یہ ہے کہ غلام ملک، پس ماندہ اور شکست خوردہ تہذیب اور احساس کمتری سے کچلی ہوئی ادبی قوم میں از خود یہ جرأت نہ پیدا ہوتی کہ وہ غالب کو دنیا کے بڑے شاعروں کی صف میں بٹھادے۔ یہ درست ہے کہ غالب کے کلام میں بیسویں صدی کی پیش آمد بہت ہے، لہٰذا یہ زمانہ انھیں اپنوں ہی میں سے سمجھتا ہے۔ لیکن غالب کے یہاں بیسویں صدی کے ذہن یا جدید ذہن کی دریافت تو حالی اور بجنوری نے ہی کی تھی۔

غالب نے اپنی چھوٹی چھوٹی خود نوشتیں جو دو تین جگہ لکھی ہیں، ان سے قطع نظر کریں تو "یادگار غالب" ان کی پہلی سوانح حیات ہے۔ اس کے بارے میں حالی نے آخر کتاب میں صاف لکھ دیا تھا کہ یہ اقتضاسے طبیعت اور جوش محبت کی بنا پر لکھی گئی ہے۔ لہٰذا لازمی تھا کہ "یادگار" میں غالب کے کردار و کوائف کے وہ پہلو کم سے کم نمایاں کیے جائیں جن سے غالب کی شخصیت پر کسی قسم کی ضرب پڑتی ہو۔ بعد میں یگانہ نے رباعیوں اور مختصر نثری تحریروں کے ذریعہ غالب کو برا بھلا کہنے میں کچھ کمی نہ کی، لیکن ان کی تحریر میں ذاتی تعصب اور احساس کم تری کا تیزاب زیادہ تھا، تنقید کا آب زلال کم۔ مغربی انداز کو شعوری طور پر اختیار کرنے والوں میں ڈاکٹر عبداللطیف سر فہرست ہیں۔ اُنھوں نے اپنی کتاب Ghalib: a Critical appreciation of his life and Urdu verse (مطبوعہ ۱۹۲۸) میں غالب پر سخت نکتہ چینی کی، لیکن ان کے یہاں مغربی انداز سے زیادہ مغرب زدہ احساس کم تری نظر آتا ہے۔ غلام رسول مہر (اول ایڈیشن ۱۹۳۶) نے محتاط توصیف کا انداز اختیار کیا۔ لیکن چوں کہ اُنھوں نے غالب کے اردو فارسی خطوط سے خوب استفادہ کیا تھا، اس لیے ان کی سوانح عمری کا رنگ بھی مغربی رنگ سے قریب ہے۔ مہر نے حالی کی ایک دو غلطیاں بھی دبی زبان سے گنوائی ہیں۔ لیکن بقول شیخ محمد اکرام "شاید انگریزی تعلیم اور مغربی طرز تنقید کے پرستار بھی اس امر سے متفق ہوں گے کہ تنقیدی نقطہ نظر سے بھی غالب کے متعلق بہترین کتاب ایسے شخص کی لکھی ہوئی ہے جو انگریزی سے قریب قریب نابلد تھا، یعنی حالی۔"(۱)

شیخ محمد اکرام کی "آثار غالب" پہلے "غالب نامہ" کے نام سے ۱۹۳۷ء میں چھپی اور

(۱) "آثار غالب"، چوتھا ایڈیشن، صفحہ ۱۸۸

۱۹۳۹ء میں "آثار غالب" کے نام سے نئی شکل میں نئی کتاب کے روپ میں لاہور سے شائع ہوئی۔ اس کا ذیلی عنوان ہے: "مرزا اسد اللہ خاں غالب کی زندگی اور تصانیف کا تفصیلی مطالعہ، جدید علم نفسیات اور فن تنقید کی روشنی میں۔" آج جس قسم کی سوانح عمریاں مغرب میں لکھی جا رہی ہیں (بعض لوگ انھیں Psychobiography کہتے ہیں) اور ان میں جس طرح صاحب سوانح کے ذاتی (اکثر ناگفتنی) حالات کرید کرید کر لکھے جاتے ہیں، ان کے سامنے "آثار غالب" بہت سیدھی سادی اور بے رنگ، لیکن اپنے زمانے کی اکثر انگریزی سوانح عمریوں سے بھی زیادہ صاف گو ہے اور یہ بڑی بات ہے۔

شیخ اکرام اور ان کے بعد خورشید الاسلام اور رالف رسل کی وسیع و عریض Ghalib Life and Letters (اول ایڈیشن ۱۹۶۹ء) میں یہ کمزوری مشترک ہے کہ تینوں حضرات کلاسیکی غزل کی شعریات سے بڑی حد تک نابلد ہیں۔ لہٰذا ان کے لیے شاعری اور سوانح میں فرق کرنا بعض اوقات مشکل ہو جاتا ہے۔ رسل اور اسلام کا انداز تحسینی ہے اور شیخ اکرام کہیں کہیں مربیانہ لہجہ اختیار کر لیتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ دونوں رویے ایک حد تک مغربی طرز فکر کا نتیجہ ہیں۔ رسل اور اسلام کا انداز فکر غالباً یہ ہے کہ ہم یہ سوانح حیات غالب کے خطوط کی روشنی میں مرتب کر رہے ہیں اور یہ ان لوگوں کے لیے ہے جو اردو سے بالکل یا کم و بیش ناواقف ہیں۔ لہٰذا اس میں ایسی باتیں نہ ہوں گی جو خطوں سے مستنبط نہ ہو سکیں اور ایسی باتیں بھی نہ ہوں گی جو کسی تازہ کو راہ دیں۔ رسل اور اسلام نے غالب کی شاعری کے بارے میں الگ سے ایک کتاب لکھنے کا جو منصوبہ بنایا تھا وہ ابھی تک شرمندۂ تکمیل نہیں ہوا ہے۔ زیر بحث کتاب میں غالب کی شاعری یا نثر پر کوئی اظہار خیال نہیں۔

شیخ اکرام نے غالب کی "نیچرل شاعری" کے بارے میں لکھا ہے: "ان کے ہاں نیچر فقط ایک دلچسپ شاعرانہ موضوع ہے...... مرزا کو نیچر سے وہ والہانہ دل بستگی نہ تھی جو ورڈز ورتھ کو تھی۔ لیکن جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں، نیچرل شاعری کی نشو و نما ایک شاعر کے ماحول پر منحصر ہے۔"(۱) یعنی غالب بے چارے شہری آدمی تھے، انھیں دیہات اور صحرا اور جنگل سے کیا واسطہ ہو سکتا تھا؟ حالانکہ ظاہر ہے کہ نام نہاد "نیچرل شاعری" کا غالب کے یہاں فقدان

(۱) "آثار غالب" صفحہ ۲۵۵

دراصل شعر کی نوعیت اور ماہیت کے بارے میں مغرب سے مختلف خیالات واصول کے باعث ہے، نہ کہ ان کے "شہری" ہونے کے باعث۔

غالب کی "عشقیہ" شاعری کے بارے میں شیخ صاحب کا خیال ہے کہ زیادہ تر اشعار میں "محبت کی خیالی اور رسمی تصویریں" ہیں۔ "ان اشعار میں غالب کی زندگی کے شخصی واقعات یا محبت کے متعلق اس کا خاص نقطۂ نظر نہیں ڈھونڈا جاسکتا۔ یہ اشعار ذہنی مشق کی مثالیں ہیں...... یہ اشعار کسی نیم نفسیاتی حقیقت یا قلبی واردات کا اظہار نہیں۔"(۱) یہاں بنیادی بات یہ ہے کہ غالب جس شعریات کے پیرو اور پابند تھے اس میں نفسیاتی حقیقت یا شخصی واقعات یا قلبی واردات کی وغیرہ کا بیان کوئی خاص اہمیت نہ رکھتا تھا۔ غالب کی "عشقیہ شاعری بائرن کی شاعری نہ تھی جس کے بارے میں بائرن نے لکھا ہے کہ "شاعری تخیل کا پگھلا ہوا لاوا ہے جس کے پھٹ پڑنے سے زلزلے کا سدباب ہو جاتا ہے۔"(۲) اور نہ یہ ورڈز ورتھ کی شاعری تھی جس کے بارے میں ورڈز ورتھ کا خیال تھا کہ "شاعری وہ جذبات ہیں جنہیں ہم عالم سکون میں دوبارہ اپنے حافظے میں مجتمع کرتے ہیں۔"(۳) شیخ اکرام نے "جدید فن تنقید" سے انگریزی کی رومانی تنقید مراد لی، لہٰذا ایسی غلطیاں یا غلط فہمیاں لازمی تھیں۔

نتالیا پری گارنا کی روسی تصنیف "مرزا غالب" کا نہایت سلیس اور دلکش اردو ترجمہ (از اسامہ فاروقی) ہم ماہنامہ "سب رس" حیدر آباد میں پڑھتے رہے ہیں۔ یہ کتاب کئی لحاظ سے دلچسپی کی حامل ہے۔ اوّل تو یہ کہ روسی زبان میں یہ غالب کی پہلی مفصل سوانح عمری ہے۔ دوسری غیر ملکی زبانوں میں جو سوانح عمریاں ہیں (مثلاً رسل اور خورشید الاسلام کی Ghalib: life and letters) وہ پری گارنا کی کتاب کے مقابلے میں ذرا محدود ہیں، کیوں کہ پری گارنا نے اپنی کتاب میں نفسیاتی، سیاسی، تاریخی اور تہذیبی پس منظر کو بھی پیش

---

(۱) "آثار غالب" صفحہ ۲۵۵-۲۵۶

(۲) خط بنام مس مل بینک (Miss Millbanke) مورخہ ۱۰ نومبر ۱۸۱۳ء

(۳) دیباچہ Lyrical Baleads (دوسرا ایڈیشن ۱۸۰۰ء) عام طور پر یہ مضمون Poetry and Poetic Diction کے نام سے معروف ہے۔

کیا ہے۔ انھیں غالب سے اتنی ہی محبت ہے جتنی شیخ اکرام، رسل اور خورشید الاسلام کو ہے (بلکہ پری گارنا کی عقیدت ان لوگوں سے شاید کچھ بڑھ کر ہی ہو گی۔) پھر بھی انھوں نے غالب کی عیب پوشی کی ہے نہ عیب جوئی، بلکہ سب معاملات کو سیدھے سچے طور پر اپنے نقطہ نظر سے بیان کر دیا ہے۔ مارکسی طرز فکر اور مکتب خیال کی پروردہ ہونے کی وجہ سے انھوں نے تاریخ کے سلسلے میں مارکسی مصنفین مثلاً کنور محمد اشرف اور خود مارکس سے خوشہ چینی کی ہے، لیکن وہ ان کی اندھی مقلد نہیں ہیں۔

ایک بہت اہم بات یہ ہے کہ نتالیا پری گارنا کلاسیکی اردو فارسی کی شعریات سے تھوڑی بہت واقفیت رکھتی ہیں۔ انھیں اس بات کا بھی احساس ہے کہ شاعری تہذیب کا اظہار ہوتی ہے، نہ کہ سماجی حالات کا مشینی خود کار انعکاس۔ واضح رہے کہ جدید مارکسی نقادوں، خاص کر لوسین گولڈمان Lucien Goldman نے اس بات سے انکار کیا ہے کہ ادب میں سماجی حالات کا مشینی، خود کار انعکاس ہوتا ہے۔ لیکن آج بھی ہمارے یہاں کے "ترقی پسند" نقاد اس مفروضے کے موید معلوم ہوتے ہیں۔) پری گارنا کو اس بات کا بھی پورا احساس ہے کہ ہمارے یہاں قبل جدید معاشرے میں شاعر کا مقام یہ تھا کہ وہ معاشرے کا ایک کار آمد فرد تھا اور اس کا کام تھا شعر کہنا۔(۱) لہٰذا شاعری صناعت تھی اور شاعر صناع۔ ("صناع" بمعنی اہل حرفہ یا پرولتاری نہیں، جیسا کہ محمد حسن سمجھے ہیں، بلکہ بمعنی باہنر شخص)۔ شاعر چوں کہ لفظوں کا کام کرتا تھا اس لیے اس کے یہاں مہارت اور ہنر مندی میں حکمت اور عقل بھی شامل ہوتی تھی۔ لہٰذا اگر شاعر قصیدہ لکھ رہا ہے تو وہ جھوٹ کا کاروبار نہیں کر رہا ہے اور نہ ایسا کوئی "ناپاک دفتر" تیار کر رہا ہے جو "عفونت" میں سنڈاس سے بدتر ہے۔ وہ محض اپنی مہارت اور حکمت کا اظہار کر رہا ہے، تاکہ وہ روزی کما سکے اور دنیا پر اپنے کمال کا سکہ بٹھا سکے۔ پری گارنا کہتی ہیں (باب ۱۳):

> "متاخر جاگیردارانہ سماج کے تاریخی حالات میں اور اس سماجی نظام کے
> آدرشوں اور معیارات اور ادب کی نسبت سے روایت کے مطابق

---

(۱) جس کے برخلاف، روایتی سوویت نظام میں بہت سے شاعر اس لیے جیل یا سائبیریا بھیج دیے جاتے تھے کہ وہ کوئی "کام" نہ کرتے تھے۔

کیے جانے والے تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھیں تو یہ نقطۂ نظر بالکل
فطری تھا۔ (یعنی "ادبی مشاغل" سے حاصل ہونے والی کمائی کے
بارے میں علمی اور غیر رومانی نقطۂ نظر) ادبی پیشے کی ایک نوع کے طور
سے قصائد کے ذریعے رقم کا حصول روایت کے مطابق ایک قابل
قبول امر سمجھا جاتا تھا۔ ورنہ اس بنیاد پر بادشاہوں کے لیے تاج بنانے
والے سناروں اور زردوزی کے کام کے چوغے سینے والے درزیوں پر
بھی..... گھٹیا زمانہ سازی کا الزام عائد کیا جاسکتا ہے۔"

جس طرح کلاسیکی اردو غزل کی شعریات کو صحیح طور پر بیان کرنے کی پہلی کوشش اس غزل کے پاس داروں اور ورثا نے نہیں، بلکہ ایک غیر ملکی (اطالوی) ماہر السیاندرو بوسانی (Alessandro Bousani ۱۹۲۱ تا ۱۹۸۸) نے کی (ملاحظہ ہوں "اردو غزل" اور "غزل" پر اس کے مضامین جو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں شامل ہیں) اسی طرح قصیدے کے بارے میں یہ حقیقت اردو والوں نے نہیں بلکہ پری گارنا نے سب سے پہلے بیان کی ہے کہ قصیدہ جھوٹ کی پوٹ اور ذہنی و روحانی دیوالیہ پن کا مظہر نہیں تھا بلکہ ایک فن تھا، ایک ماہرانہ اور پیشہ ورانہ کارروائی تھی، جس کے اپنے آداب واصول تھے۔

مجھے پری گارنا سے یہ ضرور کہنا ہے کہ کلاسیکی اردو (فارسی قصیدہ اور غزل کی تشکیلی قوت "جاگیردارانہ سماج" کے آدرشوں اور معیارات اور تاریخی حالات میں نہیں بلکہ ہند + مسلم اور عرب + ایران تصور کائنات میں تلاش کی جانی چاہیے اور شاعر کا مرتبہ محض سلائی بُنائی کرنے والے کاریگر کا نہیں بلکہ لفظوں کے ذریعے "حکمت" بیان کرنے والے اور "کمال" ظاہر کرنے والے کا ہونا چاہیے۔ یوں ورما کی کتاب Ghalib: The man, the times (۱۹۸۹) میں شاعر کے مرتبے کے بارے میں مربیانہ یا اختصاریت پسند (Reductionist) نظریے کا اظہار نہیں ہے اور اس حد تک وہ کتاب قابل قدر ہے۔ لیکن کلاسیکی اردو شعریات کے بارے میں ورما کی معلومات یوسف حسین اور رسل اور اسلام سے بھی کم ہیں۔ پھر وہ فارسی سے نابلد ہیں۔ ان کے برخلاف پری گارنا کو فارسی کا اچھا علم اور ذوق ہے اور انھوں نے غالب کی نظم ونثر فارسی سے خوب کام لیا ہے۔

دوسری بات یہ کہ "شاعری کچھ نہیں ہے صرف مصنف کے سوانح حیات یا داخلی کوائف ہیں" کا اصول جس نے رسل اور اسلام کی کتاب Three Mughal Poets کو خراب کیا ہے اور جو بیسویں صدی کے اوائل سے ہمارے یہاں رائج ہوا، مغرب کی رومانی اور سوانحی تنقید کا ایسا اصول ہے جسے ہم لوگوں نے بہت اختصاریت پسندی (Reductionism) کے ساتھ برتا۔ یہ اصول اب مغرب والے بھی ترک کر چکے ہیں۔ لیکن اردو میں اس کا چلن اب بھی باقی ہے۔ بجنوری کے یہاں اس کے ابتدائی نقوش ملتے ہیں اور اکرام نے بھی اسے خوب برتا ہے۔ پری گارنا بھی اس کی اسیر معلوم ہوتی ہیں، اگرچہ یہاں ان کا سرچشمہ اردو کے نقاد نہیں، بلکہ مارکسی + رومانی تنقید ہے۔ اس اصول کو بے محابا برتنے کے باعث ہمارے اردو والے غالب کی غزل:

ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے

کو ۱۸۵۷ کی تباہی پر مرثیہ بتاتے رہے۔ جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ یہ غزل تو ۱۸۲۱ کی ہے جب انقلاب ۱۸۵۷ کا نام و نشان نہ تھا، تو ہم لوگ یہ کہنے لگے کہ شاعر کی چشم داخل بیں نے ۱۸۵۷ کا منظر ۱۸۲۱ ہی میں دیکھ لیا تھا! یا پھر یہ کہ ۱۸۵۷۔ نہ سہی ۱۸۲۱ سہی، لیکن تباہی و بربادی تو میر کے زمانے سے موجود تھی!!

غالب کی غزل:

در گریہ از بس ناز کی رخ ماندہ بر خاکش نگر
و آں سینہ سودن از تپش بر خاک نم ناکش نگر

کے بارے میں پری گارنا کہتی ہیں (باب ۱۳) کہ یہ غزل:

> غالب نے اس بغاوت کے زمانے ہی میں لکھی ہے۔ غزل میں ایک ایسی عورت کی تصویر کھینچی گئی ہے جو کبھی عالی رتبہ اور تونگر تھی، اور اب اس کے افلاس کے دن آگئے ہیں۔ اسے ناقابل یقین اذیتیں برداشت کرنی پڑ رہی ہیں۔ اس غزل میں واقعات کی طرف واضح اشارے تو شاید نہیں ملتے، لیکن اپنے مضمون کے اعتبار سے اسے غالب کی غزلوں میں کلیتہً استثنائی مقام حاصل ہے۔

یہاں پہلی گڑبڑ تو یہ ہے کہ یہ غزل ۱۸۴۵ء کے مطبوعہ دیوان فارسی میں شامل ہے۔ لہٰذا اس کا کوئی تعلق بغاوت ۱۸۵۷ء سے نہیں۔ دوسری بات یہ کہ مضطر مجاز کا ترجمہ جو اصل متن کے ساتھ شائع کیا گیا ہے، حسب معمول خوب ہے لیکن غزل کے صرف چھ شعر درج ہیں۔ روسی سے ناواقف ہونے کی بنا پر میں یہ معلوم کرنے سے قاصر ہوں کہ نتالیا پری گارنا نے بھی چھ ہی شعر دیے ہیں یا پوری دس شعر کی غزل کا ترجمہ دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے چھ ہی شعروں پر اکتفا کی گئی ہے۔ اگر دس کے دس شعر سامنے ہوں تو پری گارنا کا یہ دعویٰ بڑی حد تک غلط ثابت ہوتا ہے کہ غزل میں "ایسی عورت کی تصویر کھینچی گئی ہے جو کبھی عالی اور تونگر اور اب اس کے افلاس کے دن آگئے ہیں" وغیرہ۔ تیسری بات یہ کہ غالب نے اپنی غزل نظیری کے جواب میں لکھی ہے۔ نظیری کا مطلع ہے:

چشم برا ہے می رود مژگان نم ناکش نگر
در سینہ دارد آتشے پیراہن چاکش نگر

سات شعر کی یہ غزل بڑی حد تک مسلسل ہے اور اس کا مضمون عمومی طور پر یہ ہے کہ معشوق اب کسی اور پر عاشق ہو گیا ہے اور جس شخص پر وہ عاشق ہوا ہے وہ نظیری (یعنی متکلم، نہ کہ محمد حسین نظیری نیشاپوری شاعر) خود ہے:

وحشی غزالے کز حیا رم در بیاباں می خورد
رام نظیری می شود در ہوش وادراکش نگر

غالب کی غزل میں بھی یہی بات ہے کہ معشوق کو کسی اور پر عاشق دکھلایا ہے۔ جو چار شعر پری گارنا کی کتاب میں محذوف ہیں، ان میں سے دو شعر حسب ذیل ہیں:

بر مقدم صید افگنے گوشے بر آوازش ببیں
در بازگشت تو سنے چشمے بہ فتراکش نگر
بر آستان دیگرے در شکر دربانش ببیں
در کوے از خود کم ترے در رشک خاشاکش نگر

برسبیل تذکرہ عرض کر دوں کہ غالب کا "خاشاکش نگر" والا شعر نظیری کی تقریباً پوری غزل پر بھاری ہے۔ بنیادی بات یہ ہے کہ اس غزل میں کہیں سے بھی اس عورت کی

تصویر نہیں آتی جس کا ذکر پری گارنا نے کیا ہے۔ اشعار کو لغوی بیانات سمجھنے کے ہی باعث اُنھوں نے ایک اور جگہ غالب کے شعر:

اس جفا مشرب پہ عاشق ہوں کہ سمجھے ہے اسد
مال سنی کو مباح اور خون صوفی کو حلال

سے یہ نتیجہ نکالنے کی کوشش کی ہے کہ غالب کی "ستم پیشہ ڈومنی" شیعہ تھی یا تشیّع کی طرف مائل تھی۔ اس سلسلے میں اُنھوں نے کسی "الٰہی بخش حاکم احمد خاں" کی کسی تحریر کا حوالہ دیا ہے۔ میرا خیال ہے اہل غالب میں شاید ہی کوئی "الٰہی بخش حاکم احمد خان" یا ان کی تحریر کو جانتا ہو۔ (مجھے تو یہ نام بھی غلط معلوم ہوتا ہے۔) بہرحال پری گارنا خود لکھتی ہیں کہ الٰہی بخش کی روایتیں قابل اعتبار نہیں اور "یہ بھی ممکن ہے کہ اس واقعے کا ماخذ محض یہ شعر ہو۔" (باب۵)

جب شیعہ ڈومنی یا طوائف کے وجود کے بارے میں شواہد کیا، کسی قسم کی زبانی گپ بھی ہم تک نہیں پہنچی ہے، تو نتالیا پری گارنا کو زیادہ احتیاط لازم تھی۔ لیکن وہ الٰہی بخش کے بیان کردہ قصے سے اتنی متاثر ہو گئیں کہ اُنھوں نے شعر کو شاہد کے طور پر استعمال کیا اور پھر اس شہادت سے انکار بھی کیا، لیکن لکھ دیا کہ "ایک بات البتہ صاف ہے، وہ دل فریب تھی اور قیاس غالب یہ ہے کہ وہ ڈوم ذات کی معمولی "بت پرست"، کافر اور "بے دین" لڑکی تھی اور مرزا اس کی خاطر اپنا مذہب بدلنے کے لیے تیار تھے۔" اس دعوے کی دلیل وہ اس طرح کا شعر پیش کرتی ہیں (باب۵):

آخر کار گرفتار سر زلف ہوا
دل دیوانہ کہ وارستۂ ہر مذہب تھا

غزل کی رسومیات اور غزل گوئی کے شرائط کو نظرانداز کر کے اسے مغربی طرز کی lyric فرض کرنے کے یہی نتائج ہوتے ہیں۔

نتالیا پری گارنا کی کتاب کے سب سے عمدہ حصے وہ ہیں جہاں اُنھوں نے سبک ہندی، خیال بندی، اور تجریدی استعارہ و پیکر سے مملو شاعری سے بحث کی ہے۔ یہاں اُنھوں نے اردو کے نقادوں (مثلاً خورشید الاسلام کی کتاب "غالب: ابتدائی دور") اور حالی سے کسب

فیض کیا ہے۔ غالب کے اسلوب کا شجرہ بیان کرنے میں اُنھوں نے روسی ہیئت پسندوں کا اصول بھی پیش نظر رکھا ہے۔ وہ کہتی ہیں (باب ۳):

> مرزا غالب کی ابتدائی شاعری متعدد ادبی ادوار کے تاریخی ارتقا کا نتیجہ ہے، جن میں ابتدائی مغلیہ عہد کی سولہویں صدی کی فارسی شاعری، آخری مغلیہ عہد کی سترہویں اور ابتدائی اٹھارویں صدی کی فارسی شاعری اور اسی طرح سے بشمول میر اٹھارویں صدی کی اردو شاعری شامل ہے۔ اٹھارویں صدی کے اختتام اور انیسویں صدی کے آغاز کی اردو شاعری کی اس پیڑھی کے شاعر اس میں شامل نہیں ہیں جو شاعری میں غالب کے قریب ترین متقدمین یا "آبا" کے زمرے میں ہیں۔ لیکن دنیائے شاعری میں آبا و اخلاف کے درمیان سلسلہ ارتقا عام طور سے اتنا استوار نہیں ہوتا جتنا چچا بھتیجوں کے درمیان۔ "آبا" کے زمرے سے اپنی شاعری کے اس دور میں غالب نے صرف ایک ناسخ کو چنا۔ اردو شاعری میں اپنے "اجداد" کے زمرے سے اُنھوں نے میر، انشا اور سودا کا انتخاب کیا۔ لیکن بنیادی توجہ اُنھوں نے "سبک ہندی" کے فارسی گو شاعروں بیدل، صائب، غنی کاشمیری اور شوکت بخاری یعنی ان شاعروں کو دی جن کے مرزا "پرپوتے" لگتے ہیں، کیوں کہ جیسا کہ روسی شاعر لوسپ مندیلشتام نے کہا ہے "بہت سے ایسے خزانے ہیں جن سے پوتے محروم رہ جاتے ہیں اور ان پر تصرف پرپوتوں کا ہوتا ہے۔"

نتالیا پری گارنا نے غالب کے شجرۂ شاعری میں انشا، سودا اور ناسخ کو شامل کر کے غیر معمولی بصیرت کا ثبوت دیا ہے۔ مندیلشتام کا اقتباس اور چچا بھتیجوں والا نکتہ (جو براہ راست اشکلاوسکی سے مستعار ہے) پری گارنا کی اصول سازی میں روسی ہیئت پسندوں کے اثر کی نشان دہی کرتا ہے۔ میں مندرجہ بالا اقتباس پر اتنا ہی اضافہ کر سکتا ہوں کہ غالب کی صرف ابتدائی شاعری نہیں، تمام شاعری میں وہی اثرات نظر آتے ہیں جن کا ذکر پری گارنا

نے اوپر کیا ہے۔

میرا ارادہ تھا کہ دیباچے کے نام پر دو تین صفحات لکھ کر فرض سے ادا ہو جاؤں۔ لیکن پری گارنا کی کتاب میں اتنے مسائل اور اتنے پہلو سمٹ آتے ہیں کہ خود میرے خیالات کو مہمیز لگی اور میں دیباچے کے نام پر دور دور کے گلی کوچوں میں بھٹکتا پھرا۔ پری گارنا نے اردو فارسی کا مطالعہ محض رسمی یا محدود سطح پر نہیں کیا ہے۔ ان کا ثقافتی اور ادبی شعور بھی ہمدردانہ غور وفکر اور سبک ہندی کی شاعری سے فطری مناسبت کے ذریعے پروان چڑھا ہے۔ ان کی معلومات وسیع اور تعصبات بہت کم ہیں۔ یہ بات قابل لحاظ ہے کہ روسی زبان میں یہ کتاب ۱۹۸۶ میں شائع ہوئی تھی، یعنی اس زمانے میں جب روسی مملکت میں اظہار وفکر کی وہ آزادی نہ تھی جو آج ہے۔ اس کے باوجود پری گارنا کی کتاب روایتی رسمی سوویت مفروضات سے آزاد ہے۔ غالب کی زندگی ایک کم و بیش بے رنگ زندگی تھی۔ ۱۸۵۷ کے سوا اس میں کوئی تلاطم، کوئی تشدد آمیز واقعہ، کوئی روح فرسا المیہ نظر نہیں آتا۔ کلکتے کا طویل سفر انھوں نے ضرور کیا تھا، مگر اس کے بعد ان کا چشمۂ حیات کسی اہم موڑ سے آشنا نہ ہوا۔ اس نسبتاً غیر دلچسپ زندگی نامے کو پری گارنا کے بیانیے نے دلچسپ اور دلکش بنا دیا ہے۔

محمد اسامہ فاروقی کا ترجمہ عام طور پر رواں اور پڑھنے میں آسان ہے۔ اس کے پہلے وہ مخدوم محی الدین کی حیات اور شاعری کے بارے میں الیکسی سوخاچیف (Alexei Sokhachev) کی کتاب کا ترجمہ دنیا کے سامنے پیش کر چکے ہیں۔ (مکتبۂ شعر و حکمت، حیدر آباد، ۱۹۹۳) مخدوم کے مقابلے میں غالب پر کتاب کا ترجمہ زیادہ صبر آزما کام تھا۔ اسامہ فاروقی نے نتالیا پری گارنا کے تعاون سے یہ کام بخوبی انجام دیا ہے۔ پری گارنا نے فارسی اردو کے اقتباسات روسی زبان میں خود ترجمہ کر کے شامل کتاب کیے تھے۔ ان تمام کی اصل تلاش کر کے انھیں بجنسہ (یا اردو ترجمے میں) درج کیا گیا ہے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ غالب کے فارسی اشعار کا منظوم ترجمہ بھی (مترجم مضطر مجاز) اکثر و بیشتر شامل کر لیا گیا ہے۔ ترجمہ تقریباً ہر جگہ کامیاب اور درست ہے اور کتاب کی افادیت بڑھاتا ہے۔

یون ورما کی کتاب کی طرح پری گارنا کی کتاب بھی غالب کی تہذیب اور ثقافت کو اندر سے دیکھنے اور پھر وہاں سے غالب کی حیات و کائنات کو بیان کرنے کی کوشش ہے۔ (یہ الگ

بات ہے کہ پون ورما کو فارسی نہیں آتی، لیکن اُردو انھوں نے صرف غالب سے دلچسپی کے باعث سن بلوغ کو پہنچنے کے بہت بعد سیکھی۔) اردو والے غالب پر آج تک ایسی کوئی کتاب بہم نہ پہنچا سکے یہ ہم سب کے لیے لمحہ فکریہ ہے۔

سوانح غالب کا ایک پہلو اور مالک رام

جناب مالک رام کے بارے میں اظہار خیال کرنا ایک خوش گوار فرض ہے۔ لیکن پھر بھی میں اسے ادا کرنے سے گریزاں رہا ہوں۔ جب کسی شخص کی ذات اور کارنامہ اس طرح متحد ہوں کہ دونوں میں فرق نہ ہو سکے اور جب اس شخص سے آپ کے مراسم بھی ہوں اور وہ آپ کا بزرگ بھی ہو، تو اس کے بارے میں قلم اُٹھانا خوش گوار فریضے کے بجائے روح فرسا امتحان بن جاتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ مجھے مالک رام صاحب سے اختلاف نہیں ہے۔ منجملہ اور چیزوں کے وہ ماہر غالبیات بھی ہیں اور غالب سے مجھے بھی دور کی نسبت ہے۔ نئے زمانے کی روشنی سے تھوڑا بہت فیض یاب ہونے کے باعث میں دین بزرگاں خوش نہ کردن کو صاحب نظر ہونے کی دلیل بھی جانتا ہوں۔ لہٰذا میں مالک رام سے اختلاف ضرور رکھتا ہوں اور اس اختلاف کے برملا اظہار سے ڈرتا بھی نہیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اکا دکا یا دس پانچ جگہ اختلاف کرنے سے مالک رام صاحب کا حق نہیں ادا ہوتا۔ کیوں کہ اختلاف یا اتفاق کی کوئی بھی لے چاہے وہ کتنی ہی بلند آہنگ کیوں نہ ہو، اس پورے شخص کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتی جس کا نام مالک رام ہے۔ میں خود کو تنقید نگار سمجھتا ہوں اور مرتب کتاب نے مجھ سے اس مضمون کا تقاضا شاید اسی لیے کیا ہے کہ وہ بھی مجھے تنقید نگار سمجھتے ہیں۔ لہٰذا میرا کام تحریر کے حسن و قبح کو واضح کرنا اور ممکن ہو تو اس کے جھوٹ سچ کو الگ کرنا ہے۔ شخصیت نگاری میرا کام نہیں۔ لیکن مالک رام ان چند لوگوں میں سے ہیں جن کے بارے میں لکھنا اور جن کی تحریر کے بارے میں لکھنا، دونوں مجھے ایک نظر آتے ہیں۔ اس مختصر سے غیر رسمی دیباچے کے بعد میں برسرِ مطلب آتا ہوں۔

غالب کے سوانح حیات کے ایک پہلو پر مالک رام صاحب کی دو تحریروں پر تھوڑا بہت اظہار خیال کر کے میں ان کی غالب شناسی سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا، لیکن ان کی غالب شناسی، بلکہ ان کی محققانہ شان کی نوعیت ضرور ظاہر کر سکتا ہوں۔ محقق کسے کہتے ہیں؟ اس سوال کا جواب آسان ہے، لیکن محقق بننا آسان نہیں۔ ظاہر ہے کہ تحقیق کے عام یا معمول لوازم مثلاً پس منظری معلومات، محنت، تلاش، احتیاط، شواہد کو پرکھنے اور ان کا کھرا کھوٹا الگ کرنے کی صلاحیت، یہ چیزیں کم و بیش مشق اور مشقت سے حاصل ہو سکتی ہیں۔ اعلیٰ درجے کا حافظہ جیسا کہ شیرانی یا قاضی عبدالودود کو نصیب تھا، وہ سب کو نصیب نہیں ہو سکتا۔ لیکن ان سب سے بڑھ کر ایک شے ہے، جسے میں موضوع کی روح میں ہمدردانہ بصیرت کے ساتھ اُتر جانے کی صلاحیت کے نام سے تعبیر کرتا ہوں۔ یہ وہ صلاحیت ہے جس کی بنا پر محقق اور اس کا موضوع من تو شدم تو من شدی کے مصداق ہو جاتے ہیں۔ دونوں کے طرز فکر اور طرز احساس میں ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے۔ ایسے محقق کے لیے اپنے موضوع کا کوئی راز سربستہ نہیں رہ جاتا۔ وہ فوراً محسوس کر لیتا ہے کہ یہ شخص کہاں جھوٹ بول رہا ہے اور کہاں سچ؟ کسی موقعے پر اس شخص کا عمل یا ردِ عمل کیسا ہوتا، اس کا اسے (یعنی محقق کو) جبلی یا فطری احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں، ایسا محقق اپنے موضوع کو اس طرح زندہ کر دیتا ہے کہ آپ محقق کی تحریر پڑھ کر یہ محسوس کرتے ہیں کہ آپ خود اس شخص سے مل لیے جو اس کی تحقیق کا موضوع ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا محقق، اشخاص ہی کو موضوع بحث بناتا ہے۔ ادوار یا تحریکات سے اس کو اس قدر شغف نہیں ہوتا۔ مغربی ادب میں اس طرح کے محقق کی پہلی مثال جان لونگسٹن لوز John Liningstone Lowes ہے جس نے آج سے کوئی ساٹھ برس پہلے (۱۹۲۷ء) کولرج کی دو اہم نظموں کے تقریباً ہر پیکر، ہر تشبیہ اور ہر استعارے کی اصل اور ان کے مآخذ کا سراغ لگایا۔ ہمارے زمانے میں جوائس (Joyce) اور یے ٹس (Yeats) پر رچرڈ ایلمین Richard Ellman اور ملارمے پر والیس فاؤلی Wallace Fowlie اس کی مثالیں ہیں۔ اردو کی طرف دیکھیے تو مسعود حسن رضوی ادیب اور انیس اور واجد علی شاہ، امتیاز علی عرشی اور غالب اور مالک رام اور غالب ایسے محقق کے اعلیٰ نمونے ہیں۔

ایسا نہیں ہے کہ ایسا محقق غلطی نہیں کرتا۔ لیکن یہ غلطی اس طرح کی نہیں ہوتی کہ کسی کتاب کا نام یا کسی واقعے کی تاریخ غلط درج ہو جائے۔ اعلیٰ درجے کا محقق، جسے وجدانی محقق کہا جاسکتا ہے، غلطیاں بھی وجدانی ہی قسم کی کرتا ہے۔ یعنی اس سے تعبیر و تشریح کی غلطی ہو سکتی ہے۔ یہ غلطی اسی طرح کی ہوتی ہے کہ جیسے آپ کسی شخص سے بخوبی واقف ہوں، لیکن اس کی کسی بات یا اس کے کسی کام کا غلط مطلب نکال لیں۔ تعبیر و تشریح کی ایسی غلطی اگر بنیادی اور مرکزی حیثیت نہ رکھتی ہو تو اس سے آپ کی فہم اور اس شخص کے بارے میں آپ کے علم کی صداقت پر چنداں حرف نہیں آتا۔ یہ ایسا ہی ہے کہ گویا پریم چند کے ناولوں میں مشرقی یوپی کے بارے میں بعض تفصیلات غلط ہیں، لیکن ان کے باوجود مشرقی یوپی کی روح کے بارے میں ہم جتنا ان ناولوں کے ذریعہ جان سکتے ہیں، اتنا تاریخوں سے نہیں جان سکتے اور نہ مجنوں گورکھپوری کے ناولوں سے ہی جان سکتے ہیں، جن میں تفصیلات تو صحیح ہیں، لیکن مشرقی یوپی کی روح نہیں ہے۔

اس کی مثال مالک رام کے ایک پرانے مضمون ''میرزا غالب، حالات، عادات، خصائل'' میں دیکھی جاسکتی ہے۔ (یہ مضمون ''فسانۂ غالب'' میں شامل نہیں ہے۔ اگر میرا مشورہ شامل ہوتا تو میں اسے ''فسانۂ غالب'' میں سرفہرست رکھتا۔ یہ مضمون ایک فرضی شخصیت کی طرف سے واحد متکلم کے صیغے میں ہے۔ متکلم نے غالب کے ''چشم دید'' حالات لکھے ہیں۔ متکلم کی شخصیت فرضی ہونے کے باوجود غالب کی شخصیت اور مزاج کی جو تصویر اس مضمون سے بنتی ہے وہ ہزاروں محققوں کی باریک بیانیوں پر بھاری ہے۔) اس مضمون کا ایک مختصر اقتباس ملاحظہ ہو۔ غالب اپنے بچپن کے حالات بیان کر رہے ہیں۔ یہ ان کی اور متکلم کی پہلی ملاقات ہے۔ (۱۸۵۲ء):

> ''میں نے باقاعدہ طور پر مکتب جانا اور پڑھنا لکھنا، دس بارہ برس کی عمر سے پہلے ہی چھوڑ دیا تھا۔ اس پر بڑے خاں صاحب (یعنی خواجہ غلام حسین خاں کمیدان، میرزا صاحب کے نانا جان) بہت خفا ہوئے۔ والدہ بھی بہت ناراض ہوئیں۔ ماموں نے بھی سمجھایا۔ لیکن بیکار۔ معلوم نہیں میرے سر پر آوارگی کا بھوت کچھ ایسی بری طرح سوار

تھا کہ کچھ اثر نہ ہوا اور میں نے دوبارہ مکتب کی طرف منھ نہیں کیا۔ (پھر مسکرا کر کہنے لگے) اب سوچتا ہوں کہ شاید کچھ ایسا بڑا نقصان بھی نہیں ہوا۔ بھلا وہ تعلیم جاری رہتی تو زیادہ سے زیادہ یہی ہوتا نا کہ لوگ مجھے عالم اور مولوی کہنے لگتے۔ لیکن جتنا علم مجھے اب ہے اس سے کیا حاصل ہوا کہ مزید کی آرزو ہو۔ چالیس برس کی بک بک سے:

کھلا کہ فائدہ عرض ہنر میں خاک نہیں

اسی طرح تھوڑی دیر باتیں کرتے رہے، کچھ مجھ سے کچھ اپنے آپ سے جب میں نے اجازت چاہی تو فرمایا۔ بھائی کو سلام شوق کے بعد کہنا کہ دل ان کے دیکھنے کو بہت چاہتا ہے، اور یہ شعر سنایا:

مالذت دیدار ز پیغام گرفتیم
مشتاق تو دیدن ز شنیدن تشناسد

اور دیکھو، اب کے جو دلی آنا تو میرے ہی پاس ٹھیرنا۔ اس میں تکلف کی کوئی بات نہیں۔ اسے بھی اپنا ہی گھر سمجھو۔

("احوال غالب"، مرتبہ مختار الدین آرزو، صفحہ ۹۲)

اس ساری عبارت میں صرف ایک واقعی بات ہے، اور وہ بھی غیر قطعی۔ یعنی یہ کہ غالب نے بہت نوعمری ہی میں تعلیم ترک کر دی تھی۔ نوعمری کا تعین "دس بارہ برس کی عمر" سے کیا گیا ہے، جو غیر قطعی ہے اور عین ممکن ہے کہ پوری طرح درست بھی نہ ہو، کیوں کہ خود مالک رام کی اپنی "توقیت غالب" (مشمولہ، "عیار غالب" ۱۹۶۹ء اور "فسانۂ غالب" ۱۹۷۷ء) سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب کی تعلیم بارہ برس کی عمر تک جاری رہی۔ لیکن اس کے باوجود غالب کا تشخص اس عبارت کے ذریعہ جس خوبی سے ہوتا ہے، وہ اس سوال کے جواب سے ممکن نہیں کہ غالب نے جب تعلیم ترک کی تو ان کی عمر کے سال کے مہینے تھی؟ عبارت کے الفاظ، لب ولہجہ، غالب کے نانا اور ماموں کا ذکر، تعلیم اور عرض ہنر کی بے فائدگی کی بات، خاص کر یہ بات کہ پڑھتے لکھتے تو عالم یا مولوی ہی تو کہلاتے، غالب کے ایک اردو مصرعے اور ایک فارسی شعر کا برمحل حوالہ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ پوری تقریر میں الفاظ

کی نشست اور لہجہ، یہ چیزیں غالب کو ہمارے سامنے لے آتی ہیں اور ان کے ذریعہ غالب کے بارے میں ہماری معلومات علم کا درجہ اختیار کر لیتی ہیں۔ مالک رام کے اس پورے مضمون میں وہی شان ہے جو آندرے مورو ا(Andre' Maurois) کی ان سوانح عمریوں میں ہے جن میں اس نے بعض انگریز اور فرانسیسی ادیبوں کے حالات ناول کے طرز پر لکھے ہیں۔

آپ کہہ سکتے ہیں، پھر یہ تحقیق کیا ہوتی، یہ تو ایک طرح کی افسانہ نگاری ہوتی۔ (شاید مالک رام صاحب بھی ایسا ہی سمجھتے ہیں، کیوں کہ اُنھوں نے یہ مضمون اپنے مجموعے "فسانۂ غالب" میں شامل نہیں کیا۔) بات صحیح ہے۔ اگر آپ تحقیق کے معنی یہی لیتے ہیں کہ فلاں شعر کی فلاں قرأت فلاں مخطوطے میں ہے اور فلاں مخطوطہ مصنف کا دیکھا ہوا ہے اور مصنف جب (مثلاً) ہوشیار پور پہنچا تو اس وقت شام کے ساڑھے سات نہیں بلکہ سوا چھ بجے تھے تو مالک رام کا یہ مضمون یقیناً محققانہ نہیں ہے۔ لیکن اگر محقق کا یہ بھی منصب ہے (اور یقیناً ہے) کہ وہ جس شخص یا زمانے کے بارے میں لکھ رہا ہے اس کو ہمارے سامنے زندہ کردے تو یہ مضمون اعلیٰ درجے کا تحقیقی کارنامہ ہے۔ یہ جھگڑا تو طے ہو نہیں سکتا کہ ترک تعلیم کے وقت غالب کی صحیح عمر کیا تھی، لہٰذا اس پر وقت کو غیر ضروری طور پر ضائع کرنے سے یہی بہتر ہے کہ غالب کی شخصیت کا تعین کرنے میں سعی کی جائے۔

لیکن "فسانۂ غالب" تحقیقی کتاب ہے اور غالب کی تعلیم کا ذکر چل نکلا ہے۔ لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ افسانوی مضمون کو چھوڑ کر غالب اور عبدالصمد کے قضیے پر مالک رام کے خیالات کا مطالعہ کیا جائے۔

اس مضمون میں اُنھوں نے قاضی عبدالودود جیسے شخص کی اس رائے سے اختلاف کیا ہے کہ عبدالصمد ایک فرضی شخص ہے۔ مالک رام نے یہ مضمون قاضی عبدالودود کے جواب میں لکھا تھا۔ قاضی صاحب نے اس مضمون کے جواب میں اپنے اصل مضمون میں بعض حواشی اور استدراکات کا اضافہ کیا۔ مالک رام صاحب کا مضمون جس شکل میں "فسانۂ غالب" میں شامل ہے، وہ قاضی صاحب مرحوم کے حواشی اور استدراکات کو نظر میں رکھنے کے بعد تیار ہوئی ہے، لہٰذا زیر بحث مضمون کو ہم اس مسئلے پر مالک رام کی مکمل اور پوری طرح سوچی سمجھی رائے کہہ سکتے ہیں۔

قاضی صاحب مرحوم اور مالک رام کے دلائل کا مطالعہ کریں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مالک رام صاحب کے یہاں طرف داری کا تھوڑا بہت رنگ ہے، لیکن قاضی عبدالودود کم و بیش یہ فیصلہ کر کے چلے ہیں کہ غالب نے چوں کہ بہت سے معاملات میں غلط بیانی سے کام لیا ہے، اس لیے عبدالصمد کے بارے میں بھی غالب کے بیانات کو مشکوک ہی سمجھنا چاہیے۔ قاضی صاحب مرحوم کا یہ اصول ہندوستانی قانون شہادت Indian Evidence Act پر مبنی ہے، لیکن اُنھوں نے غالب کے معاملے پر اس کا اطلاق جس شدت سے کیا ہے، اتنی شدت شاید خود قانون شہادت کا مقتضا نہ تھی۔ بہر حال، قاضی صاحب نے ایک بات ایسی کہی ہے جو اس سارے معاملے میں کلیدی حیثیت رکھتی ہے۔ (بشرطے کہ وہ بات صحیح ثابت ہو جائے۔) قاضی صاحب فرماتے ہیں: ("احوال غالب" صفحہ ٢٦٩) "میں مقالۂ ہٰذا کی فصل ٥ میں لکھ چکا ہوں کہ یہ بحث کہ عبدالصمد وجود خارجی رکھتا تھا یا نہیں، اس کی صفات سے جدا نہیں کی جاسکتی"۔ قاضی صاحب کا یہ ارشاد مبہم ہے، لیکن اس کے معنی (جو پورے مضمون کو پڑھ کر اور قاضی صاحب کی خاصی الجھی ہوئی عبارت سے الجھنے کے بعد حاصل ہوتے ہیں) یہ ہیں کہ عبدالصمد کے وجود کا فرضی یا اصلی ہونا اس بات پر منحصر ہے کہ اس کے بارے میں کس طرح کی باتیں غالب نے بیان کی ہیں اور غالب کی تحریروں کو پڑھ کر عبدالصمد کی لیاقت علمی و لسانی کے بارے میں کیا اندازہ ہو سکتا ہے؟ قاضی صاحب فرماتے ہیں کہ عبدالصمد کے صفات اور غالب کے صفات میں ایسا توافق ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب نے اپنی شخصیت پر قیاس کر کے عبدالصمد کی تخلیق کی تھی۔ ایران قدیم کے بارے میں غالب کی معلومات بہت کم ہیں۔ اگر غالب نے واقعی کسی ایسے شخص سے تعلیم حاصل کی ہوتی جو علوم فارسیہ کا ماہر تھا، تو یہ بات نہ ہوتی۔ قاضی عبدالودود کہتے ہیں:

> "سب سے بڑی دشواری یہ تھی کہ ایران قدیم سے متعلق غالب کے معلومات بہت قلیل تھے اور جو کچھ تھے وہ بھی بہت کچھ غلط۔ وہ کسی طرح ایک ایسی ہستی کے خالق نہیں ہو سکتے تھے جس کے معلومات ان سے وسیع تر اور صحیح تر ہوں۔ ان اصحاب کے لیے جو قدیم ایرانی زبانوں اور زردشتی مذہب سے کسی حد تک بھی باخبر ہیں، ایک ایسے

زردشتی عالم کے وجود کا قائل ہوتا جو "پشتن" کی جگہ "پشستن" کو
صحیح سمجھتا اور "چنیود" کو مستحدث مانتا ہو، ممکن نہیں۔"

تعجب ہے کہ مالک رام نے اتنے وزنی اعتراض کا جواب باقاعدہ نہیں دیا ہے۔ وہ یہ ضرور کہتے ہیں:

"...... ہم غالب کے سہو اور غلطی کے لیے استاد کو کیسے ذمہ دار ٹھہرا سکتے ہیں؟ اور اگر غالب نے ٹھیک روایت کی تھی اور واقعی استاد نے انھیں جو کچھ سکھایا تھا وہ آج علم کی کسوٹی پر ٹھیک نہیں اترتا تو ہم اس سے استاد کے وجود سے کیوں کر انکار کر سکتے ہیں؟ اس صورت میں صحیح طریقہ یہ ہوگا کہ ہم یہ فیصلہ کریں کہ استاد واقعتاً اتنا قابل یا عالم فاضل نہیں تھا، جتنا اس کا شاگرد بتا رہا ہے...... ہم زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ استاد نے شاگرد کو جو کچھ بتایا، وہ غلط تھا:...... لیکن اس سے آپ یہ ثابت نہیں کر سکتے کہ سرے سے استاد کا وجود ہی نہیں تھا اور شاگرد نے اپنے دماغ سے یہ بات گڑھ لی تھی۔"

مالک رام نے جو منطقی اصول متعین کیا ہے (غالب کا سہو علمی استاد کے عدم وجود پر دال نہیں ہو سکتا) وہ بہت اہم اور بنیادی ہے۔ اس کی بنیاد ایک ہمہ گیر قضیے پر ہے اور اس کا اطلاق علمی تحقیق و تفتیش کے کئی میدانوں میں ہو سکتا ہے۔ تعجب ہے کہ قاضی صاحب جیسا محقق اور منطقی اس کو نظر انداز کر گیا۔ اگر غالب نے کچھ غلط باتیں عبدالصمد سے منسوب کی ہیں تو اس کا منطقی نتیجہ یہ نہیں ہے کہ عبدالصمد تھا ہی نہیں۔ اس کا منطقی نتیجہ تین شقوں میں بیان ہو سکتا ہے: ۱۔ غالب جھوٹ بول رہے ہیں، ان کے استاد نے انھیں وہ باتیں نہیں سکھائی تھیں۔ انھیں سند کی تلاش ہے، لہٰذا انھوں نے وہ باتیں عبدالصمد سے منسوب کر دیں۔ ۲۔ غالب کو سہو ہوا ہے، عبدالصمد نے یہ باتیں ان کو نہیں سکھائی تھیں۔ ۳۔ عبدالصمد نے غالب کو غلط تعلیم دی تھی۔ لہٰذا عبدالصمد کا عدم وجود غالب کے سہو پر مبنی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہ بات ضرور ہے کہ غالب کی کم علمی (جیسا کہ قاضی صاحب کا دعویٰ ہے) عبدالصمد کے وجود کے بارے میں شکوک ضرور پیدا کر سکتی ہے۔ قاضی صاحب کا ارشاد ہے،

کہ ایران قدیم کے بارے میں غالب کی معلومات بہت محدود ہیں اور جو ہیں بھی وہ مخدوش۔ اگر غالب نے عبدالصمد جیسے کسی شخص کی شاگردی کی ہوتی تو ایسا نہ ہوتا۔

مالک رام صاحب اس باب میں خاموش ہیں، لیکن ایسا نہیں کہ یہ اعتراض بالکل مسکت ہو۔ اس کا جواب، بلکہ اس کے کئی جواب ممکن ہیں۔ مالک رام نے حالی کی شہادت کو بنیادی قرار دیتے ہوئے قاضی عبدالودود کی بعض باتوں کو لائق اعتنا نہیں سمجھا ہے۔ لیکن ان کا جواب اسی وقت مکمل و مدلل کہا جائے گا جب وہ قاضی صاحب کے تمام نکات کو قرار واقعی طور پر رد کریں۔ لیکن قاضی صاحب نے بعض جگہ غلط بحث سے کام لیا ہے اور مالک رام نے اس کی وضاحت بڑی خوبی سے کی ہے۔ مثلاً قاضی صاحب نے یہ اصول بہت صحیح قائم کیا ہے کہ "عبدالصمد اگر وجود خارجی رکھتا اور غالب اس کے شاگرد ہوتے تو اس سے کچھ نتائج مرتب ہوتے۔" لیکن اس سے ان کا یہ استنباط کہ یہ نتائج غالب کی شاعری پر عبدالصمد کے ایرانی ہم عصروں کے اسلوب کا اثر اور عبدالصمد کے زمانے کے "مخصوص ایرانی" محاوروں اور روزمروں کا ان کے کلام میں وجود کی شکل میں ظاہر ہوتے، محل نظر ہے۔ موجودہ زمانے میں ہزاروں لوگوں نے امریکہ یا انگلستان میں برسوں تعلیم پائی ہے، لیکن ان کی تحریر و تقریر پر اپنے زمانے کی امریکی یا انگلستانی بولی اور اسلوب ادب کا اثر یکساں نہیں۔ بعض لوگوں میں یہ اثر نہ ہونے کے برابر ہے، بعض لوگوں میں معتدبہ ہے۔ مالک رام اس باب میں یوں رقم طراز ہیں:

> "غالب نے جو کتابیں بھی عبدالصمد سے پڑھی ہوں، بہت کم امکان ہے کہ وہ ان کتابوں سے مختلف ہوں جو ان کے زمانے میں ہندوستان میں دستیاب ہوتی تھیں اور جو عہد مغلیہ سے یہاں کے مدارس میں رائج اور زیر درس و مطالعہ تھیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ استاد محض کسی کتاب کا متن پڑھا دینے پر اکتفا نہیں کرتا، وہ تشریح و توضیح میں جو کچھ طالب علم کے ذہن نشین کرتا ہے، دیکھا جائے تو تعلیم کا بنیادی اور اہم حصہ وہی ہوتا ہے۔ اس سے شاگرد کی نظر وسیع ہوتی ہے؟ اسے زبان کے ان رموز و دقائق سے واقفیت حاصل ہوتی ہے، جو کسی

قواعد کی کتاب میں منضبط نہیں ملتے، اس کے دل میں مزید مطالعے کا
شوق پیدا ہوتا ہے، جس سے نہ صرف بتدریج اس کے علم میں اضافہ
ہوتا ہے، بلکہ نکتہ آفرینی کی صلاحیت بیدار ہوتی ہے۔"

لہٰذا غالب نے عبدالصمد سے باقاعدہ معلومات کے بجائے وہ چیز زیادہ حاصل کی ہوگی جسے ہم "زبان کا ذوق" کہہ سکتے ہیں۔ بلکہ کوئی ضروری نہیں کہ غالب نے عبدالصمد سے کچھ کتابیں ہی پڑھی ہوں۔ غالب نے خود کہیں نہیں لکھا ہے کہ میں نے عبدالصمد سے کتابیں پڑھیں۔ وہ تو "آئین معنی آفرینی و کیش یگانہ بینی" اور "لطائف فارسی" اور "غوامض فارسی آمیختہ بہ عربی" اور "حقائق و دقائق زبان فارسی" کا ذکر کرتے ہیں کہ اُنھوں نے یہ چیزیں عبدالصمد سے حاصل کیں۔

قاضی عبدالودود نے لفظ "صمد" کے معنی کے بارے میں غالب کا قول "تیغ تیز" سے نقل کیا ہے۔ غالب نے اس ضمن میں مولانا فضل حق اور عبدالصمد کا ذکر کچھ اس یقین آفریں انداز میں کیا ہے کہ پورا واقعہ بالکل سچا معلوم ہوتا ہے۔ قاضی صاحب اس کو غالب کا "فن کارانہ سلیقہ" کہتے ہیں اور اشاروں اشاروں میں یہ بھی کہتے ہیں کہ غالب میں قصہ نویسی کا بھی مادہ تھا۔ مالک رام اس سلسلے میں خاموش ہیں۔ شاید اُنھوں نے اس بات کو چنداں لائق جواب نہ سمجھا ہو۔ اگر مولانا فضل حق اور غالب کی یہ گفتگو محض من گڑھنت ہے تو غالب میں افسانہ گوئی کی صفت بدرجۂ اتم موجود تھی۔ لیکن خود قاضی صاحب بعض اوقات دوسروں کے افسانوں یا سرسری بیانات کو غیر ضروری اہمیت دیتے نظر آتے ہیں۔ مثلاً حالی اور غالب کے مراسم کے بارے میں غلام رضا خاں نے عبدالغفور شہباز کو لکھا کہ حالی تو غالب کے یہاں گاہ گاہ ہی آتے تھے۔ "ان کی نشست وہاں زیادہ نہ تھی۔" اس غیر ذمہ دارانہ بیان کو قاضی صاحب قبول کرتے ہیں اور مالک رام نے اس پر اچھی گرفت کی ہے۔

مالک رام صاحب نے عبدالصمد کا وجود ثابت کرنے کے لیے مشاق وکیل کی طرح دلائل اور براہین فراہم کیے ہیں۔ قاضی صاحب کے سرد اور عاری از جذبات انداز کے بالمقابل وہ پرجوش نظر آتے ہیں۔ لیکن کیا عبدالصمد کے وجود کی تصدیق کرتے ہیں۔ عبدالصمد کا خط بھی، جو غالب کے نام آیا، اس کے وجود کی دلیل بھی شیفتہ کے حوالے سے

حالی ہی ہیں۔ دوسری طرف حالی ہی کا بیان ہے کہ کبھی کبھی خود غالب کی زبان سے سنا گیا ہے کہ عبدالصمد محض ایک فرضی شخص ہے، چوں کہ لوگ مجھے بے استادا کہتے تھے، اس لیے میں نے آپ استاد گڑھ لیا۔ مالک رام نے قاضی صاحب کے اس اعتراض کا جواب نہیں دیا ہے کہ حالی نے ان بیانات کے تضاد کو محسوس کیا اور ان میں تطابق پیدا کرنے کی کوشش کی۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس کوشش میں انھیں کامیابی نہ ہو سکی۔ "لیکن مالک رام صاحب نے یہ نکتہ بہت خوب نکالا ہے کہ "کہیں زیادہ اہم بات یہ ہے کہ غالب کی زبان سے یہ سب کچھ سننے کے بعد بھی حالی لکھتے ہیں کہ "عبدالصمد فی الواقع ایک پارسی نژاد آدمی تھا اور مرزا نے اس سے کم و بیش فارسی زبان سیکھی تھی۔" ظاہر ہے کہ حالی ایمان دار آدمی تھے۔ اگر انھیں کسی قسم کا شک ہوتا کہ عبدالصمد کا وجود محض غالب کی اختراع ہے تو وہ یہ جملہ اتنے حتمی انداز میں نہ لکھتے۔ وہ غالب کی مدلل مداحی ضرور کر رہے تھے (جیسا کہ قاضی صاحب کا ارشاد ہے)، لیکن عبدالصمد کی شاگردی غالب کے لیے کوئی مایۂ افتخار نہ تھی کہ جس کو ثابت کرنا حالی کے لیے ضروری ہوتا۔ اگر ان سب باتوں کے باوجود حالی صاف صاف یہ کہتے ہیں کہ عبدالصمد واقعی ایک شخص تھا اور غالب نے اس سے فارسی پڑھی تھی، تو ہمیں یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ کم سے کم حالی کی نظر میں عبدالصمد ایک واقعی شخص تھا اور غالب کے "بحر تخیل کی ایک موج" نہیں، بلکہ غالب کی ادبی شخصیت کے سرچشموں میں سے ایک تھا۔

ایک نکتہ، جس پر مالک رام کی نظر نہیں گئی ہے، خود اس بات سے متعلق ہے کہ غالب کی زبان سے کبھی کبھی سنا گیا کہ عبدالصمد کا کوئی وجود نہیں۔ حالی یہ تو کہتے نہیں کہ میں نے خود غالب کو یہ کہتے سنا کہ عبدالصمد فرضی شخص ہے۔ حالی صرف یہ کہتے ہیں کہ غالب کی زبان سے کبھی کبھی سنا گیا۔ ہمارے پاس اس بات کی کوئی شہادت نہیں کہ غالب نے واقعی ایسا کہا تھا۔ حالی یہ بھی نہیں بتاتے کہ یہ بات ان سے کس نے کہی۔ ممکن ہے انھیں غلام رضا خاں نے کہی ہو جنھوں نے شہباز کو لکھا کہ عبدالصمد کا وجود ذہن میں تھا، اس روایت کے مطابق غالب نے عبدالصمد کی شخصیت اس لیے گڑھی کہ لوگ انھیں بے استادا کہتے تھے۔ لیکن اگر یہ صحیح ہے تو غالب نے یہ بھی کیوں نہ کہا کہ عبدالصمد نے ان کے فارسی کلام پر اصلاح دی تھی؟ ظاہر ہے کہ "بے استادا" کے معنی یہ نہیں ہیں کہ غالب کا کوئی معلم نہ تھا۔ (اور اگر یہ

معنی ہیں بھی تو بے استاد ہونے کاالزام سراسر بے بنیاد اور لاطائل ٹھہر تا ہے اور اس کی تردید کی کوئی ضرورت نہیں نظر آتی۔) ظاہر ہے کہ "بے استادا" کے معنی ہیں "وہ شخص جس کا کوئی استاد فن شعر میں نہیں۔ وہ شخص جس کے کلام کو کسی استاد کی اصلاح کا استناد حاصل نہیں۔" یہ بات بھی ظاہر ہے کہ زبان فارسی کے دقائق و غوامض کو عبدالصمد سے حاصل کرنے کا دعویٰ اس اعتراض کو رفع نہیں کر سکتا کہ غالب "بے استادے" ہیں۔ لہٰذا عبدالصمد کی شخصیت کو ایجاد کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ لہٰذا مجھے اس بات میں بہت شک ہے کہ غالب کی زبان سے واقعی کبھی یا اکثر یہ سنا گیا ہو کہ میاں عبدالصمد محض ایک افسانہ ہے، لوگ مجھے بے استادا کہتے تھے، ان کا منہ بند کرنے کے لیے میں نے اسے ایجاد کر لیا۔ جب تک کوئی معتبر شہادت اس بات کی نہ ملے کہ غالب نے واقعی ایسا کہا تھا، میں اس روایت کو انتہائی ضعیف قرار دوں گا اور عبدالصمد کے جھگڑے میں اس پر کوئی تکیہ نہ کروں گا۔

ممکن ہے کہ قاضی صاحب مرحوم کو اس بات کا احساس رہا ہو۔ ان کا خیال یہ ہے کہ عبدالصمد کو ایجاد کرنے کی ضرورت اس لیے پڑی کہ غالب کو خوف تھا کہ لوگ "قاطع برہان" پر اعتراضات کریں گے اور ان کے مبلغ علم پر شک کریں گے۔ لہٰذا انھوں نے حفظ ماتقدم کے طور پر عبدالصمد کا ذکر "قاطع برہان" میں کیا۔ قاضی صاحب فرماتے ہیں:

> "غالب دنیا کو یہ دکھانا چاہتے تھے کہ میں نے "فارسی کی تحقیق کو اس پائے پر پہنچایا ہے کہ اس سے بڑھ کر متصور نہیں..... غالب کے لیے یہ بھی ممکن نہ تھا کہ ہندوستان کا تنہا فارسی داں سمجھے جانے کا دل سے نکال دیں۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہے، غالب نے ایک ایسا فرضی استاد گڑھ لیا جو علوم عربیہ و فارسیہ پر یکساں تبحر رکھتا تھا اور اس تبحر کو دوسرے فارسی دانان ہند پر اپنے تفوق کی وجہ بتایا۔"

اگر یہ نظریہ صحیح ہے تو "بے استادا" ہونے والی بات غیر ضروری ہو جاتی ہے اور عبدالصمد کے فرضی ہونے کے بارے میں ایک بہ ظاہر مضبوط دلیل بے کار ہوئی جاتی ہے۔ "قاطع برہان" کی اشاعت اول (۱۸۶۲ء) کے وقت غالب پینسٹھ سال کے تھے۔ ظاہر

ہے کہ یہ عمر ایسی نہ تھی کہ انھیں "بے استادا" کہا جاتا، یا اگر کہا بھی جاتا تو اس مہمل بات کی کوئی اہمیت ہوتی۔ لہٰذا غالب کا یہ مبینہ قول کہ لوگ مجھے "بے استادا" کہتے تھے، ۱۸۶۲ء کے بہت پہلے کا ہونا چاہیے، یعنی اس زمانے کا جب خود غالب کی استادی پوری طرح قائم نہ ہوئی تھی۔ لیکن اگر قاضی صاحب کا خیال درست ہے تو غالب نے عبدالصمد کی "ایجاد" کچی عمر میں، اور اپنی استادی پوری طرح قائم ہو جانے کے بعد کی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت انھیں "بے استادا" کہے جانے کی کوئی فکر نہ تھی اور نہ ہو سکتی تھی۔ ان کے زمانے کی دلی کے دو بڑے فارسی داں جنھیں ان کا حریف قرار دیا جا سکتا تھا (یعنی مومن اور صہبائی) دونوں ہی "قاطع برہان" کی اشاعت کے بہت پہلے انتقال کر چکے تھے۔ آزردہ کو غالب کم و بیش اپنا دوست قرار دیتے تھے، حریف نہیں۔ لہٰذا انھیں آزردہ کی طرف سے اس طعنے کا خوف نہ تھا۔ ایسی صورت میں ٦۵ سالہ غالب کو کیا ضرورت تھی کہ وہ عبدالصمد کی ایجاد کرتے؟ اور اگر وہ اوائل عمری اور اوائل استادی میں "بے استادا" کہے جانے کے جواب میں "عبدالصمد" کو اپنا استاد بتا چکے تھے تو پھر قاضی صاحب کا یہ خیال بے اصل ہو جاتا ہے کہ غالب نے "قاطع برہان" کی اشاعت کے وقت حفظ ماتقدم کے طور پر عبدالصمد نام کا "فرضی استاد گڑھ" لیا۔ دوسری طرف، یہ بھی ملحوظ رکھیے کہ اگر اوائل عمری اور اوائل استادی میں غالب کو "بے استادا" کہا گیا تو عبدالصمد کی ایجاد اس طعن کو رفع نہیں کر سکتی، کیوں کہ عبدالصمد جو بھی رہا ہو، اس کے بارے میں غالب نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ اس نے میرے کلام پر اصلاح دی۔ ایک بات یہ بھی دھیان میں رکھیے کہ اگر اپنے لیے کسی استاد کی ایجاد غالب نے کبھی ضروری سمجھی ہوگی تو وہ کلکتے والے معاملے کا وقت رہا ہوگا۔ لیکن اس وقت نہ تو کسی نے غالب کو "بے استادا" کہا اور نہ غالب نے عبدالصمد کا ہی ذکر کیا۔ کلکتے میں غالب انتیس تیس سال کے نووارد تھے، وہاں زیادہ امکان تھا کہ لوگ ان پر تعریض کرتے کہ جناب آپ کس استاد کے شاگرد ہیں جو قتیل وغیرہ کو استناد سے عاری قرار دیتے ہیں؟ لیکن وہاں ایسی کوئی بات نہ ہوئی۔

غالب کے جن بیانات کی بنا پر قاضی صاحب یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ غالب نے عبدالصمد سے اصلاح شعر بھی حاصل کرنے کا دعویٰ کیا ہے۔ ان کے بارے میں مالک رام صاحب کا

محاکمہ صحیح معلوم ہوتا ہے کہ ان بیانات سے اصلاح شعر کے معنی مستنبط نہیں ہوتے۔ یوں بھی عبدالصمد جو بھی رہا ہو، شاعر نہ تھا۔ لہٰذا اس سے اصلاح شعر حاصل کرنے میں کسی قسم کا اعزاز نہیں، بلکہ ایک طرح کی توہین ہی ہے کہ استاد بنایا بھی تو ایک غیر شاعر کو۔

لہٰذا عبدالصمد کے وجود پر مالک رام صاحب کے دلائل غالب کے مزاج وافتادِ طبع سے ان کی وجدانی مناسبت کے آئینہ دار ہیں اور مدلل فکر کا بھی حکم رکھتے ہیں۔ ان کے دلائل پر اضافہ کیا جاسکتا ہے، ان کے بعض استدلال بہت مستحکم نہیں ہیں، لیکن مجموعی طور پر ان کا فیصلہ اس وقت تک کی معلومات اور فکر کی روشنی میں صحیح ہے۔ عبدالصمد یقیناً ایک شخص تھا۔ اب یہ معاملہ عبدالصمد اور غالب کے درمیان ہے کہ شاگرد نے استاد سے کیا سیکھا اور کیا پایا۔

گفتن سخن از پایۂ غالب نہ ز ہوش است
امروز کہ مستم خبرے خواہم ازو داد

میرزا غالب، دیوانِ غزلیات فارسی

غالب افسانہ

میں نسلاً راجپوت اور مولداً نظام آباد، ضلع اعظم گڑھ کا ہوں۔ اعلیٰ حضرت مہابلی خلد آشیانی کے وقتوں میں بلیا اور اس کے اطراف کے بھومی ہاروں نے کچھ شورش کی تو ان کی سرکوبی کے لیے افواج شاہی علاقہ پٹیالہ، جے پور، اور جھنجھنو سے بھیجی گئیں۔ ان میں بہت سے راجپوت، پٹھان اور سید بھی تھے۔ شورش تو بہت جلد فرو ہو گئی، لیکن فوج کے سواروں، نفروں اور بعض رسالداروں کو بھی پورب کے یہ علاقے اتنے پسند آئے کہ بکثرہم یہیں بس رہے۔ سرائے رانی، سنجر پور، خراسان (جسے اب خراسوں کہتے ہیں)، سرائے میر یہ مواضعات اسی زمانے میں آباد ہوئے۔ نظام آباد البتہ قدیم الایام سے موجود تھا۔ کہا جاتا ہے کہ جیوش اکبری کے ساتھ آنے والوں میں کچھ میرے بھی اجداد تھے جنھوں نے نظام آباد میں سکونت اختیار کی۔ لیکن ہمارے گھرانے کو اصل فروغ تب ملا جب شہنشاہ ہندوستان و دکن، اعلیٰ حضرت محی السنت والدین فردوس مکانی اورنگ زیب عالم گیر کے مبارک دور دورۂ سلطانی میں اعظم خان اور عظمت خان دو بھائیوں کو دستک شاہی کے ذریعے ان اطراف کی جاگیر وطنی تفویض ہوئی۔ اعظم خان نے اعظم گڑھ آباد کیا اور عظمت خان نے اعظم گڑھ سے کوئی دس کوس شمال مغرب میں عظمت گڑھ۔ اعظم خان کے سوار و منصب داروں میں سے کچھ بے شک میرے اجداد تھے جو علاقہ پنجاب سے اُٹھے تھے اور یہاں نظام آباد میں آبسے۔

ہم لوگ ہے ہے بنس کے چندر بنسی راجپوت ہیں۔ جنگ و جدل کے علاوہ علم و ہنر بھی ہمارے گھرانے کی پہچان رہا ہے۔ فردوس آرام گاہ اعلیٰ حضرت روشن اختر محمد شاہ بادشاہ غازی کے عہد سعادت بنیاد میں زمین واملاک کے جھگڑے اُٹھے تو ہمارے ایک بزرگ نے ناراض

ہو کر علاحدگی اختیار کرلی۔ اور یہ علاحدگی اتنی شدید ہوئی کہ اُنھوں نے اسلام قبول کرلیا۔ ان کے اخلاف بھی مسلمان رہے، اور بحمد اللہ اب بھی کہیں کہیں جو احیا ہیں، مذہب اسلام کے پیرو ہوں گے۔ میرے جد اعلیٰ اپنے قدیمی مسلک پر رہے، اور میں بھی ایشور کی کرپا سے اسی پر قائم ہوں۔ اپنے مسلمان بھائیوں سے ہمارا ربط آہستہ آہستہ پھر استوار ہوا تو ملنا جلنا، ریت رسم، یہاں تک کہ ایک آدھ بار تو شادی بیاہ کے بھی مراسم بن گئے۔ ایسے موقعوں پر تلوار تک چلنے کی نوبت آگئی، لیکن مرور ایام کے ساتھ سب برابر ہو گیا۔

ہمارے دادا نے اسلحہ سازی کا کام شوقیہ اختیار کیا۔ وہ کہتے تھے کہ انسان کو اپنے اسلحے کے بارے میں ویسا ہی علم و اعتماد رکھنا چاہیے جیسا اپنی اولاد یا بیوی کے بارے میں ہوتا ہے۔ وہ فرماتے تھے کہ اپنا اسلحہ خود بنانے سے بہتر کوئی طریقہ اپنے ہتھیار کو جاننے اور سمجھنے کا نہیں ہے۔ اول اول تو وہ قدیم انداز کے تیغے، جمدھر اور شیر پنجے ہی بناتے تھے، لیکن ایک عیسائی پادری کے طعنہ دینے پر کہ تم ہندوستانی لوگوں کو ہمارے ہتھیار بنانا مشکل ہے، اُنھوں نے طرح طرح کی قرابینیں، وگاڑے اور تمنچے بھی بنانے شروع کر دیے اور اس فن میں وہ اس قدر کامیاب ہوئے کہ کمپنی بہادر کے سپاہی اور اطراف کے ڈکیت دونوں ہی بڑی قیمت دے کر ان سے ہتھیار مول لے جاتے تھے۔ میرے باپ کا زمانہ آتے آتے ہمارا پیشہ اسلحہ بازی کے بجائے اسلحہ سازی ہو گیا۔

ہمارے قصبے نظام آباد کے بعض تال تلیوں میں ایک خاص قسم کی سیاہ مٹی نکلتی ہے۔ اس کے برتن بہت اچھے بنتے ہیں، اور دور دور دساور کو جاتے ہیں۔ ایک کمھار کا بیٹا میرا دوست بن گیا تو میں نے بابوجی قبلہ سے چوری چھپے اس کا فن بھی سیکھ لیا۔ کیا معلوم تھا کہ ایک دن اس ہنر سے مجھے کچھ تمتع بھی ہو سکے گا۔

ہمارے گھرانے کی دونوں شاخیں اعظم خان اور عظمت خان کی اولادوں، اور اس طرح آل تیمور کے فرماں رواؤں کی خدمت کو اپنا دین و ایمان جانتی تھیں۔ بکسر کی جنگ [۱۷۶۴ء، مرتب] میں بکسریے تو دونوں طرف سے لڑے تھے، کہ کچھ کرائے کے ٹٹوؤں کے طور پر کمپنی بہادر کے جھنڈے تلے تھے، اور کچھ ایسے تھے جو حضور فیض گنجور اعلیٰ حضرت

شاہ عالم ثانی شہنشاہ ہند اور نواب وزیر کی فوجوں میں تھے۔ لیکن ہمارے گھرانے کے جتنے لوگ اس جنگ میں شریک تھے، کیا ہندو کیا مسلمان، سب کے سب اعلیٰ حضرت کے لوائے سطوت وسلطنت کے ہی سائے میں تھے۔ اس جنگ میں ہمارے دونوں گھرانوں کے اکیس سورماؤں نے جام شہادت نوش کیا۔

بکسر کے بعد بھی ہماری وفاداری اعلیٰ حضرت اور نواب وزیر سے رہی۔ لیکن خود عالی جناب جنت مآب شاہ عالم ثانی نے بہار اور بنگال کی دیوانی کمپنی بہادر کو سونپ دی اور نواب وزیر اس کے چند برس بعد اللہ کو پیارے ہوئے۔ جنت مآب اپنی تمام خوبیوں اور حکمت عملیوں کے باوجود انگریز کے جال سے نہ نکل سکے۔ مراٹھا سردار مہاداجی نے اُنھیں الہٰ آباد سے نجات دلائی اور ان کا وکیل مطلق بن کر راج کرتا رہا۔ ذوالفقار الدولہ نجف خاں کی موت کے بعد جنت مآب ملکی سیاست کے نقشے پر بے اثر ہوگئے۔ مراٹھا کے مرنے کے بعد انگریز کو پھر موقع ملا تو اس نے اعلیٰ حضرت کو اپنی "حفاظت" میں لے لیا۔

لکھ لٹ نواب وزیر آصف الدولہ مبرور عدن مقام کے زمانہ مسعود و محفوظ تک تو ہم اودھ کے زیر پرورش اور زیر نگیں رہے۔ لیکن وزیر علی خان مغفور کو ہٹا کر مرزا منگلی مرحوم جنت آرام گاہ کو مسند وزارت دلانے میں خان علامہ اور دوسروں نے جو دکھ اُٹھائے اور اُٹھوائے، ان میں اودھ کے آدھے علاقے کا تحویل وزارت سے نکل کر انگریزوں کے چنگل میں جانا بھی تھا۔ اس طرح ہم لوگ لفظاً و معناً قید فرنگ میں آگئے۔ ولوں میں دھیمی دھیمی آگ سلگتی رہی، لیکن ہم کر بھی کیا سکتے تھے۔

خان علامہ اور میرے دادا میں پرانی ملاقات تھی، اور وجہ ملاقات وہی اسلحہ سازی۔ علامہ موصوف کو میرے دادا کی بنائی ہوئی کٹھریں بہت پسند تھیں۔ وہ اُنھیں منگوا کر اپنے انگریز دوستوں کو نذر کرتے تھے۔ ۱۷۹۸ء کے اواخر میں بڑے لاٹ کے دربار میں نواب وزیر کی طرف سے عہدۂ وکالت سنبھالنے کی غرض سے کلکتہ جاتے ہوئے خان علامہ اپنے بعض اعزا اور میرے دادا جان سے ملنے اعظم گڑھ بھی آئے تھے۔ دادا نے اُنھیں حسب سابق اپنی بنائی ہوئی ایک کٹھری اور ایک قرابین پیش کیں۔ لیکن اس بار اُنھوں نے تھوڑی رنجش کا بھی

اظہار کیا کہ خان علامہ نے سعادت علی خان کو نواب وزیر بنوانے میں یہ بھی خیال نہ کیا کہ الہ آباد سے لے کر بریلی تک کتنا بڑا علاقہ انگریز کے ہاتھ میں دلوا دیا گیا۔ خان علامہ نے فرمایا "بھوانی سنگھ وہ چند ضلعے دے کر میں نے اودھ کو بچالیا۔ اب کوئی دن جاتا ہے کہ اودھ کیا سارا ملک ہندہی کلکتہ کو دہلی مان لے گا۔"

میری پیدائش ۱۸۳۰ء کی ہے۔ میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھا۔ دستور کے مطابق مجھے آلات حرب و ضرب کے علاوہ قلم کا بھی ہنر سکھایا گیا۔ میں نے گھر پر فارسی، عربی اور تھوڑی بہت ریاضی سیکھی۔ پھر مولانا فاروق چریا کوٹی کے ایک شاگرد کے مدرسے میں باقاعدہ تعلیم کے لیے بٹھادیا گیا۔ میری پیدائش سے تین سال پہلے ۱۸۳۷ء میں اعظم گڑھ میں کچھ پادریوں نے ایک انگریزی اسکول کھولا تھا، ویزلی اسکول کے نام سے۔ [ویزلی اسکول ایک مدت سے ویزلی انٹر کالج ہو گیا ہے اور اپنی پرانی جگہ پر اب تک موجود ہے، مرتب۔] میرے والد کے ایک دوست جو کمپنی بہادر کی نوکری کر چکے تھے، مصر ہوئے کہ بنی مادھو کو انگریزی پڑھواؤ، کہ اسی میں اب کاربار ملکی و مالی و فوجی چلے گا۔ ان کی روز روز کی ضد سے تنگ آکر میرے قبلہ نے میرا نام وہاں لکھا ہی دیا۔ اس وقت میری عمر کوئی دس برس کی تھی۔

انگریزی مدرسے میں فارسی انگریزی، ریاضی اور تاریخ وغیرہ کے ساتھ ساتھ کرشٹان مذہب کی باتیں اور ایک نئی چیز اور پڑھوائی جاتی تھی، جسے وہ لوگ "ہندی" کہتے تھے۔ یہ تھی تو وہی ہندی، جسے ہم گھروں میں بولتے تھے، لیکن اسے سنسکرت حروف میں لکھا جاتا تھا اور اس میں ہماری ہندی کے بیٹھے، رواں لفظوں کی جگہ خدا جانے کہاں کہاں کے لفظ بھر دیے گئے تھے۔ مجھے وہ زبان بڑی عجیب سی لگی۔ میں سوچا کرتا تھا کہ بڑا ہو کر ریختہ لکھوں گا، ہندی کا شاعر بنوں گا۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس نئی "ہندی" میں حضرت میر تقی میر اعلیٰ اللہ مقامہ ' اور قبلہ میر ببر علی صاحب انیس کی طرح کا کلام کیوں کر ممکن ہو سکے گا۔ میں نے بعض ماسٹر صاحبان کو یہ بھی کہتے سنا کہ "ہندی" ایک الگ زبان ہے۔ یہ ہندوؤں کی زبان ہے، مسلمانوں کی زبان ریختہ یا اردو کہلاتی ہے۔

اس اسکول میں کچھ ایسے بھی بچے تھے جن کی وہاں کے اساتذہ میں بڑی آؤ بھگت تھی۔

چہرے بشرے اور چال ڈھال سے تو وہ ہمارے ہی جیسے تھے، اگرچہ ذرا نیچی ذات کے، لیکن ان کے نام عجیب تھے، آدھے ہندوستانی اور آدھے کرسٹانی۔ مثلاً ایک لڑکے کا نام تھا سیموئل سنگھ۔ ایک اور لڑکا تھا، اس کا نام تھا لارن داس (بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ اصل میں یہ لارنس داس تھا)۔ ایک اور لڑکا جو ہم میں سب سے بڑا تھا، جان مسیح الدین کہلاتا تھا۔ وہ ہاتھ پاؤں کا اچھا تھا اور موقع بے موقع ہم لوگوں کو پیٹنے سے گریز نہ کرتا تھا۔ یہ سب لڑکے کوئی چیز بپتسمہ ہوتی تھی وہ کرا کے کرسٹان ہو چکے تھے۔ میں سمجھتا تھا کہ بپتسمہ بھی ختنے کی قسم کی کوئی رسم ہوتی ہوگی۔ لیکن پھر پتہ چلا کہ اس میں کسی متبرک پانی کے چھینٹے دیئے جاتے ہیں۔

خیر، ان لڑکوں میں ہم لوگوں کے خلاف ایکا بہت تھا۔ اور وہ کوشش کر کے ہم لوگوں سے مختلف لہجے میں اور خلاف محاورہ ہندی بولنے کا خاص التزام رکھتے تھے۔ مجھے تو وہ ایک آنکھ نہ بھائے۔ اس لیے نہیں کہ اُنھوں نے بپتسمہ کرایا تھا، بلکہ اس لیے کہ وہ ہم لوگوں کو اپنے سے کمتر سمجھتے تھے۔ اسکول میں ایک دو انگریز بھی تھے۔ اور میرے لیے انگریزوں کو قریب سے دیکھنے کا یہ پہلا موقع تھا۔ ان کی بولی میری سمجھ میں نہ آتی تھی، لیکن خدا معلوم کیوں مجھے ان سے ڈر لگتا تھا۔ ہم لوگوں سے وہ بہت میٹھے لہجے میں بولتے، لیکن موقع پڑنے پر سخت سزا دینے سے نہ چوکتے تھے۔ وقت کی پابندی وہاں بہت تھی۔ میں ہمیشہ دیر تک سونے والا، اکثر تعویق سے اسکول پہنچتا اور سزا کا مستوجب ٹھہرتا۔ ایک بار میں کچھ جلدی چھٹی ہو جانے کی خوشی سے مغلوب ہو کر اسکول کے بڑے ہال کمرے سے ذرا شور و غل کرتا ہوا گزرا۔ مجھے کیا خبر تھی کہ بڑے ماسٹر صاحب سن رہے ہیں۔ فوراً پکڑ وا بلایا گیا اور دس بیت کا مستحق قرار دیا گیا۔ یہ سزا ایک جلاد صفت ماسٹر امینوئل لال کے ہاتھوں دلوائی گئی۔

میں ویزلی اسکول میں بہت دن رہا نہیں۔ ادھر میرے فرشتہ سیرت والد کو برادری والے طعنہ دیتے کہ تم بچے کو بھرشٹ کیے دے رہے ہو۔ اور ادھر مجھے اسکول کی ''ہندی''، اور جان مسیح الدین ایسے ثور صفت لڑکوں کا دست تطاول بدشوق بنائے دیتے تھے۔ تھوڑی بہت انگریزی میں نے ضرور سیکھ لی اور چھٹی جماعت میں جوں توں کر کے کامیاب

ہونے کے بعد میں نے اسکول چھوڑ دیا۔ اب وہی مدرسہ تھا اور وہی فارسی، تھوڑی سی عربی اور ریاضی و منطق دہیئت۔ گھر پر بنوٹ، گتکا، تیغ زنی، بندوق بازی کی مشق ہوتی تھی۔ محلے کے اکھاڑے میں کشتی ہو جاتی تھی۔ میں نظام آباد سے اعظم گڑھ چار کوس پیدل آتا جاتا تھا۔ اس وجہ سے بھی بدن خوب کسرتی ہو گیا تھا۔

لیکن مجھے تو شاعر بننے کی دھن تھی۔ ایک دن والد محترم نے مجھے کچھ شعر گنگناتے دیکھ لیا۔ بڑی ڈانٹ پڑی اور دادا جان سے شکایت بھی ہوئی۔ پر میسور اُنھیں پنر جنم سے بچائے، مجھ سے بڑی محبت کرتے تھے۔ بولے، "تو کیا ہوا؟ شرفا کے کاموں میں سے ایک کام یہ بھی ہے۔ اسے کچھ نہ کہو۔ ہماری ایک ہی تو اولاد ہے۔"

دو تین سال آرام سے گزرے۔ کچھ پڑھنے پڑھانے اور شعر کہنے میں اور کچھ مشق تیر و تفنگ اور تیغ وجمدھر میں۔ دادا جان بہت بوڑھے ہو چکے تھے۔ اور والد کے یہاں بھی کسی دوسری اولاد کی توقع نہ تھی۔ عام راجپوتوں کے علی الرغم ہمارے گھرانے میں تعدد ازواج کا طریقہ بالکل نہ تھا۔ ہاں چوری چھپے یا علی الاعلان، عشق کرنے کی بات اور تھی۔ لہٰذا میں تنہا ہی اولادرہ کر جیا۔ ایک دن دادا جان کو معلوم ہوا کہ خان علامہ کے دادا استاد ملا سابق بنارسی کے ایک پوتے مولوی خادم حسین ناظم ہمارے قصبے کے پاس ہی تحصیل کے صدر مقام محمد آباد میں منصف ہو کر آئے ہیں۔ دادا نے فرمایا کہ اُستاد کے بغیر شاعر نہیں بنا جاتا۔ چلو تمھیں مولوی صاحب کا شاگرد بنوا دوں۔

ہم اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار ہو کر اوّل وقت پہنچے، خان علامہ کا نام درمیان میں لا کر اطلاع کرائی۔ مولوی صاحب خود باہر آکر ہم لوگوں کو اپنے دیوان خانے میں لائے۔ عطر پان سے تواضع کی۔ مولوی صاحب مغل وضع کی چوگوشیہ ٹوپی اور جدید طرز کا لمبا چغہ پہنے ہوئے تھے۔ پاؤں میں سلیم شاہی جوتی، گلے میں ململ کا لمبا کرتا، ہاتھ میں عقیق احمر کی تسبیح۔ میں دل میں بہت ڈرا ہوا تھا، لیکن ان کو دیکھ کر ایک طرفہ فرحت کا احساس ہوا۔ گلابی جاڑے تھے، دیوان خانہ میں ہلکی ہلکی خوشبو شمامۃ العنبر کی پھیلی ہوئی تھی۔ دادا مرحوم نے عرض مدعا کی تو مولوی صاحب نے فرمایا، "میاں تخلص کیا کرتے ہو؟" میں نے دبی زبان سے عرض

کیا، "جی تخلص کا گنہگار ابھی نہیں ہوا۔" مولوی صاحب ذرا مسکرائے، ایک لمبی سی ہوں کی، پھر ایک لحظہ چپ رہ کر بولے۔ "اچھا تو میاں بینی مادھو، تم ہے ہے بنس کے راجپوت، صاحب تیغ و سپر خاندان کے چشم و چراغ، شاعری کر کے اپنے گھرانے کو رسوا کرنے پر اتارو ہو، تو لو ہم تمھارا تخلص "رسوا" تجویز کرتے ہیں۔"

دادا صاحب اور میں نے ایک زبان ہو کر کہا کہ "بہت خوب۔" مولوی صاحب نے ہاتھ اٹھا کر دعا کی، میرے سر پر ہاتھ پھیرا، اور کہا "اچھا اب اپنا کوئی شعر تو پڑھو۔" میرا تو دم ہی نکل گیا۔ کنکھیوں سے داداجان کی طرف دیکھا، لیکن وہ تو بالکل بے تعلق سے ہو گئے تھے۔ جبراً قہراً یہ مطلع میں نے پھنسی پھنسی آواز میں پڑھا:

ہستی کو حباب سمجھے گا
ہر سانس کو آب سمجھے گا

مولوی صاحب نے فرمایا "خوب۔ لیکن 'سمجھے' بروزن فاعلن اب اچھا نہیں لگتا۔ اسے 'جانے' کر دو۔" ابھی میں کچھ کہنے والا تھا کہ آپ نے مزید ارشاد فرمایا "اور میاں صاحب، سانس کو آب کہنے کی نہ کوئی دلیل ہے، اور نہ بین المصرعتین ربط ہی قائم ہوتا ہے۔ اسے یوں کر دیں، 'عالم کو آب جانے گا' اور اسے مصرع اولیٰ قرار دیں تو کیسی رہے؟ کہو کچھ عروض بھی جانتے ہو؟"

میں نے اٹک اٹک کر عرض کی "جی حضور اور اصلاحی مصرع ثانی میں تسکین اوسط ہے۔"

مولوی صاحب نے پھر فرمایا "خوب"۔ دادا صاحب گویا اب متوجہ ہوئے۔ ارشاد ہوا "سبحان اللہ حضرت، کیا اصلاحیں صادر فرمائی ہیں۔" مولوی صاحب کے اصرار پر میں نے ایک شعر اور پڑھا:

افسوس ساتھ میرے یاروں نے دشمنی کی
اس کی گلی میں رہتا تو چاکری ہی کرتا

مولوی صاحب نے ایک لحظہ سکوت فرمایا، پھر کہا، "ہاں شیخ ناسخ کے رنگ کا شعر ہے۔

شیخ مرحوم اکثر اشاروں میں بات کہتے تھے۔ خود فرمایا ہے:

ہے بیت ہی میں معنی بیت خیال بند
نزدیک ہے بہت جسے سمجھے ہیں دور ہے

لیکن تمھارے شعر کی بندش صاف نہیں بیٹھی۔ پہلا مصرع یوں کر دو۔

دنیا کی بادشاہی کس کام کی ہے میرے

اب بات ذرا سامنے کی ہو گئی، لیکن صاف ہے۔ دیکھو مبتدی کو صفائی ادا زیادہ ضروری ہے۔"

بات میری سمجھ میں ٹھیک سے نہ آئی تھی، لیکن دادا صاحب مرحوم "بہت خوب، بہت مناسب" کہتے رہے۔ مولوی صاحب نے یہ کہہ کر ہم کو رخصت کیا کہ "بھئی ہمیں اتنی فرصت نہیں کہ تم جیسے نوجوان کی آمد شعر پر اصلاح دیتے رہیں۔ کبھی کبھی ادھر سے گزر نا ہو تو ایک آدھ غزل دکھا دیا کرنا۔"

جب ہم باہر نکلے تو ہمیں دیکھ کر حیرت اور شرمندگی ہوئی کہ دو سیر شیرینی جو ہم بطور نذر لائے تھے، اس کے عوض مولوی صاحب قبلہ نے کوئی مہینہ بھر کا سیدھا اور کئی طرح کے پھل اور ترکاریاں ہمارے لیے بیل گاڑی پر لدا کر تیار کرا دی تھیں۔ مولوی صاحب اندر جا چکے تھے، شکریے کا بھی موقع نہ تھا، ہم ان کی کرم فرمائیوں اور شاعرانہ قوتوں پر عش عش کرتے گھر لوٹے۔

میں مولوی خادم حسین ناظم کا شاگرد کیا بنا کہ اپنے حسابوں فارغ التحصیل ہو گیا۔ مدرسے جانا چھوڑ کر سارا وقت شعر و شاعری اور تیر و تفنگ میں گزار نے لگا۔ پھر ایک جگہ کچھ معاملات دل بھی نکل آئے۔ کچھ ادھر کا بھی اشارہ تھا۔ بات بہت آگے نہ بڑھی لیکن دل لگانے اور دل لگی کا تو سامان تھا ہی۔ میں سولہ برس کا خاصا وجیہہ جوان نکلا تھا۔ کسرتی بدن، گھر میں کھانے پینے کی کمی نہ تھی۔ والدین کا لاڈ پیار الگ۔ اور کیا چاہیے تھا؟

لیکن وہ ۱۸۵٦ء کا سال مجھ پر کچھ عجیب بھاری گزرا۔ اودھ کی سلطنت کے انتزاع کا ہم لوگوں پر براہ راست اثر یہ پڑا کہ کلکتے کے بڑے لاٹ کے خلاف دلوں میں غم و غصہ کی لہر دوڑنے لگی۔ ایک عجیب بات یہ ہوئی کہ اشیا کی قیمتیں آپ سے آپ بڑھنے لگی تھیں۔

ضروری اشیا بھی عام لوگوں کی دسترس سے باہر ہوتی جارہی تھیں۔ ایسا لگتا تھا اودھ کی پیداوار اب مشرقی اضلاع میں آنا بند ہو گئی ہے۔ موٹے اور باریک اناج سب ایک بھاؤ ہو کر روپے کے آٹھ نو سیر بکنے لگے۔ لوگوں میں خبر اُڑی کہ کمپنی نے اودھ اور اطراف کا سارا مال ولایت بھیج دیا۔

بادشاہ جان عالم کے کلکتے پہنچنے کے چند ہفتے بعد لوگوں میں خفیہ باتیں مشہور ہونے لگیں کہ نہ صرف اودھ، بلکہ دلّی کی بھی بادشاہت واپس آنے والی ہے۔ کبھی کبھی کوئی شخص سرگوشی میں "چپاتی" نام کی کسی چیز کا ذکر کرتا جو دراصل خفیہ پیغام رسانی کا ایک طریقہ تھی۔ کبھی کوئی کہتا کہ منڈیاؤں کی چھاؤنی میں جو فوج کمپنی بہادر نے شاہ اودھ کو دبائے رکھنے کے لیے متعین کر رکھی تھی، اب وہ باغی ہونے والی ہے، یا ہو گئی ہے۔ آرکاٹ کے ڈنکا شاہ کا ذکر ۱۸۵۶ء کے اواخر میں زبانوں پر پھیلنے لگا کہ وہ جہاں جاتے ہیں، ان کے آگے آگے ڈنکا بجتا چلتا ہے کہ مسلمانوں کے سردار آرہے ہیں۔ اپنے مواعظ میں وہ (ان کا اصل نام بعد میں معلوم ہوا کہ مولوی احمد اللہ ہے) کھلے بندوں ہندو مسلمان دونوں کو انگریزوں کے خلاف جہاد و جنگ کی ترغیب دیتے۔ ان کا کہنا تھا کہ انگریزوں کی حکومت بے دینی اور باطل پر مبنی ہے۔ یہ لوگ ہندو مسلمان دونوں سے ان کا مذہب چھڑا کر انھیں خدا سے دور کر دیں گے۔

یہ سنسنی کی باتیں میرے نوجوان خون میں گرمی اور بہجت کی لہریں دوڑا رہی تھیں اور میں بھی کچھ اُلٹے سیدھے خواب دیکھنے لگا تھا، کہ میرے دادا جان کا انتقال ۱۸۵۶ء کے بالکل آخر میں اچانک تھوڑی سی علالت کے بعد ہو گیا۔ وہ چھیاسی برس کے تھے، لیکن ان کی صحت ہم نوجوانوں کی سی تھی۔ کسی کو اندیشہ نہ تھا کہ وہ اتنی جلد راہیِ ملک عدم ہوں گے۔ بعد کے زمانے میں مجھے اکثر خیال آتا کہ شاید ان کی پاک روح نے محسوس کر لیا تھا کہ اپنے وطن پر جو ستم انگریز بہادر کی طرف سے ٹوٹیں گے، ان کو دیکھنے سے پہلے ہی آنکھ بند کر لینا بہتر ہے۔
۱۸۵۷ء کو شروع ہوئے ایک دو مہینے گزرے تھے کہ چپکے چپکے یہ خبر پھیلی کہ ڈنکا شاہ کو انگریزوں نے فیض آباد میں گرفتار کر لیا ہے۔ ہمارے لوگوں میں عجب بے چینی اور کشاکش سی پھیل گئی۔ میں نے ایک دن اپنے والد کو میری ماں سے کہتے سنا کہ بینی مادھو کو اس کے ماموں

کے پاس شاہجہاں پور بھیج دو۔ یہاں حالات اب دگر گوں ہونے والے ہیں۔

پھر ایک رات یہ خبر جنگل کی آگ کی سی تیزی سے پھیلی کہ میرٹھ میں انگریزوں کے ساتھ کچھ بہت خراب سلوک دیسی سپاہیوں کے ہاتھوں ہوا اور فرنگی سب میرٹھ، بلند شہر وغیرہ چھوڑ چھوڑ کر پنجاب کی طرف بھاگ رہے ہیں۔ واقعہ کیا ہوا، اس کی تفصیل نہ معلوم ہوئی، بجز اس کے کہ سپاہیوں کو ایسے کارتوس منہ سے کاٹنے کو ملے تھے جن میں سور یا گئو کی چربی تھی۔ منگل پانڈے نامی سپاہی نے کارتوسوں کو کاٹنے سے انکار کیا اور اپنے انگریز افسر کو گولی ماردی۔ کہا جارہا تھا کہ انگریزوں نے یہ خبر دبار کھی تھی لیکن اب یہ ہر طرف پھیل گئی ہے۔ دیسی سپاہی جگہ جگہ خروج کر رہے ہیں اور اعلیٰ حضرت ظل سبحانی ابو ظفر سراج الدین بہادر شاہ ثانی کو شاہ ہند کا لقب دے کر دوبارہ تخت نشین کر دیا گیا ہے۔ دوسرے دن اور نزدیک کی یہ خبر آئی کہ دیسی سپاہیوں اور ڈاکا شاہ کے ساتھیوں نے فیض آباد کا جیل خانہ توڑ کر ڈاکا شاہ کو رہا کرالیا ہے اور اب وہ ایک جم غفیر کے ساتھ عازم لکھنؤ ہیں۔

اسی رات، بہت دیر گئے ایک تنومند بوڑھا منہ پر ڈھاٹا باندھے ہماری گڑھی پر آیا کہ میں بلیا کے بابو کنور سنگھ کا ایلچی ہوں، مجھے ٹھاکر صاحب سے ملنا ہے۔ بابو کنور سنگھ کی عمر اس وقت اسّی کے قریب تھی، ان کا راج چھوٹا سا لیکن دبدبہ دُور دُور تک تھا۔ وہ انگریزوں سے نفرت کرتے تھے اور اپنے علاقے میں آنے والے گوروں کو سر بازار گالیاں دلواتے تھے۔ میرے والد نے ایلچی سے کچھ بات کیے بغیر اس کا مدعا سمجھ لیا۔ مجھے اُنھوں نے اسی ایلچی کے ایک نائب کی معیت میں رات ہی رات شاہجہاں پور روانہ کر دیا۔ میں نے ہزار کہا کہ میں آپ کے ساتھ رہوں گا، لیکن اُنھوں نے ایک نہ مانی۔ دادا مرحوم کے برخلاف وہ مزاج کے تیز بہت تھے، اور اُن کے سامنے کسی کو تاب مقاومت نہ تھی۔ میں تو ان کا بچہ ہی تھا۔

مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ صبح ہوتے ہوتے میرے والد بھی چند جاں نثاروں کو ساتھ لے کر کنور سنگھ کی طرف نکل گئے۔ ہماری گڑھی پر میری والدہ اور کچھ بوڑھے نوکر رہ گئے۔

لڑائی کا وہ سارا زمانہ میں نے شاہجہاں پور کے ایک قصبے روضہ کے باہر اپنے ماموں کے شکاری بنگلے میں گزارا۔ ماموں کے آدمی ہر وقت مجھ پر کڑی نگاہ رکھتے کہ کہیں گھر سے نکل نہ

جاؤں۔ لڑائی کی خبریں کبھی کبھی وہاں تک پہنچ جاتی تھیں۔ ہندوستانی سپاہ کی ہر فتح کے ساتھ میرا دل بلیوں اُچھلتا اور ہر شکست کے ساتھ انتہائی ڈوب جاتا۔ ۱۸۵۸ء کا وسط آتے آتے جنگ ختم ہونے لگی تھی اور میرے صبر کا پیمانہ بھی چھلکنے لگا تھا۔ میں نے دل میں ٹھان لی کہ مناسب موقع دیکھ کر بنگلے کی اُونچی دیوار پھاند کر نکل جاؤں گا اور برجیس قدر کی سپاہ سے جا ملوں گا۔

میں اپنے لیے سواری کا انتظام کر رہا تھا۔ چاند کی آخری تاریخیں تھیں، میرا ارادہ تھا کہ اندھیاری کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے ایک دو راتوں میں وہاں سے نکل لوں۔ اچانک مجھے ایک ملازم نے چپکے سے بتایا کہ برجیس قدر، بیگم حضرت محل، مولوی احمد اللہ شاہ، یہ سب الگ الگ جنگوں میں ہزیمت اُٹھا کر شمال کی طرف جانے والے ہیں۔ اُنھوں نے ہتھیار نہیں ڈالے ہیں اور نہ اس کی کوئی توقع اُن سے یا اُن کے ساتھیوں سے ہے۔ اسی شام یہ اطلاع میرے جسم کو جھنجھوڑ گئی کہ مولوی صاحب اپنے ساتھیوں کو لے کر ہمارے دُور کے عزیز جگناتھ سنگھ راجہ پوایاں کے یہاں قیام پذیر ہونے والے ہیں۔ پوایاں ہمارے قصبے روضہ سے بہت قریب نہ تھا، لیکن ایک رات کے دھاوے میں وہاں پہنچنا ممکن تھا۔

گئی رات میں کمند لٹکا کر اور ہاتھ پاؤں تڑانے کا خطرہ مول لے کر بنگلے کی اونچی دیوار سے اترا۔ ایک وفادار ملازم دو عمدہ گھوڑوں کے ساتھ منتظر تھا۔ بے تکان بھاگتے ہوئے ہم دن نکلے پوایاں کی سرحد کے پاس پہنچے تو ہر طرف فرنگی جھنڈوں اور فوجوں کا ہجوم دیکھا۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ وہیں رُک کر میں نے سرگوشیوں میں یہ منحوس خبر سنی کہ راجہ پوایاں کی غداری نے ڈنکا شاہ کی جان لے لی۔ تھوڑی ہی دیر میں یہ بات بالکل کھل گئی جب میں نے گاؤں کی عورتوں کے ایک گروہ کو دیکھا کہ ڈنکا شاہ کے ماتم میں سینہ زنی کرتی چلی آ رہی ہیں۔ اُن کے پیچھے ہی چند عورتیں ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر جگناتھ سنگھ کو بُرا بھلا کہہ رہی تھیں۔ کمپنی کے سپاہی اُنھیں دھکیل دھکیل کر گاؤں کے اندر لے جا رہے تھے۔

دنیا میری نظر میں تاریک ہو گئی۔ یہ بات اب بالکل صاف تھی کہ ہندی افواج کو ہر جگہ شکست ہو چکی۔ اب کچھ رہا نہ تھا جس کے لیے جنگ کی جائے۔ ملازم کو تو میں نے وہیں

جاؤں۔ لڑائی کی خبریں کبھی کبھی وہاں تک پہنچ جاتی تھیں۔ ہندوستانی سپاہ کی ہر فتح کے ساتھ میرا دل بلیوں اُچھلتا اور ہر شکست کے ساتھ انتہائی ڈوب جاتا۔ ۱۸۵۸ء کا وسط آتے آتے جنگ ختم ہونے لگی تھی اور میرے صبر کا پیمانہ بھی چھلکنے لگا تھا۔ میں نے دل میں ٹھان لی کہ مناسب موقع دیکھ کر بنگلے کی اُونچی دیوار پھاند کر نکل جاؤں گا اور برجیس قدر کی سپاہ سے جا ملوں گا۔

میں اپنے لیے سواری کا انتظام کر رہا تھا۔ چاند کی آخری تاریخیں تھیں، میرا ارادہ تھا کہ اندھیاری کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے ایک دو راتوں میں وہاں سے نکل لوں۔ اچانک مجھے ایک ملازم نے چپکے سے بتایا کہ برجیس قدر، بیگم حضرت محل، مولوی احمد اللہ شاہ، یہ سب الگ الگ جنگوں میں ہزیمت اُٹھا کر شمال کی طرف جانے والے ہیں۔ اُنھوں نے ہتھیار نہیں ڈالے ہیں اور نہ اس کی کوئی توقع اُن سے یا اُن کے ساتھیوں سے ہے۔ اسی شام یہ اطلاع میرے جسم کو جھنجھوڑ گئی کہ مولوی صاحب اپنے ساتھیوں کو لے کر ہمارے دُور کے عزیز جگناتھ سنگھ راجہ پوایاں کے یہاں قیام پذیر ہونے والے ہیں۔ پوایاں ہمارے قصبے روضہ سے بہت قریب نہ تھا، لیکن ایک رات کے دھاوے میں وہاں پہنچنا ممکن تھا۔

گئی رات میں کمند لٹکا کر اور ہاتھ پاؤں تڑانے کا خطرہ مول لے کر بنگلے کی اونچی دیوار سے اُترا۔ ایک وفادار ملازم دو عمدہ گھوڑوں کے ساتھ منتظر تھا۔ بے تکان بھاگتے ہوئے ہم دن نکلے پوایاں کی سرحد کے پاس پہنچے تو ہر طرف فرنگی جھنڈوں اور فوجوں کا ہجوم دیکھا۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ وہیں رُک کر میں نے سرگوشیوں میں یہ منحوس خبر سنی کہ راجہ پوایاں کی غداری نے ڈنکا شاہ کی جان لے لی۔ تھوڑی ہی دیر میں یہ بات بالکل کھل گئی جب میں نے گاؤں کی عورتوں کے ایک گروہ کو دیکھا کہ ڈنکا شاہ کے ماتم میں سینہ زنی کرتی چلی آ رہی ہیں۔ اُن کے پیچھے ہی چند عورتیں ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر جگناتھ سنگھ کو بُرا بھلا کہہ رہی تھیں۔ کمپنی کے سپاہی اُنھیں دھکیل دھکیل کر گاؤں کے اندر لے جا رہے تھے۔

دنیا میری نظر میں تاریک ہو گئی۔ یہ بات اب بالکل صاف تھی کہ ہندی افواج کو ہر جگہ شکست ہو چکی۔ اب کچھ رہا نہ تھا جس کے لیے جنگ کی جائے۔ ملازم کو تو میں نے وہیں

نہ تھا کہ اگر وہ موجود ہو تو میرے لیے سر چھپانے کی جگہ تھی۔

اور ہوا بھی ایسا ہی۔ میرا دوست مجھے دیکھ کر رو دیا۔ کہنے لگا کہ دادا یہ سارا گھر تمھارا ہے۔ جس طرح چاہو رہو، بس منھ نہ کھولنا، ورنہ تمھاری بولی سے لوگ تمھیں پہچان جائیں گے۔ میں مشہور کردوں گا کہ تم میرے چاچا کے لڑکے ہو۔ چاچا کی موت کے بعد بنارس سے آئے ہو۔ دماغ کمزور ہونے کی وجہ سے بول نہیں سکتے۔

میں نے وہ دن اُوپری سکون سے گزارے۔ چاک کے کام کی جو مشق میں نے بچپن میں بہم پہنچائی تھی، میرے بہت کام آئی۔ باہر والوں میں کسی کو گمان نہ ہوا کہ میں پیدائشی کمہار نہیں ہوں۔

۱۸۶۰ء کا سال آتے آتے انگریزوں کی آتشِ انتقام کچھ سرد پڑنے لگی تھی۔ بھاگے ہوئے لوگ واپس آرہے تھے۔ لیکن میرے یہاں کون تھا جو واپس آتا؟ مجھے خدائے سخن کا شعر یاد آیا:

ساون ہرے نہ بھادوں ہی سوکھے ہم اہلِ درد
سبزہ ہماری آنکھ کا سیراب تھا سو تھا

کمہار کے بھیس نے شاعری پڑھنا پڑھانا بھی مجھ سے چھڑوا دیا تھا۔ لگتا تھا اب زندگی بے منت قرطاس و قلم ہی گزرے گی۔ لیکن ایک دن میرے دوست نے آکر خبر دی کہ دادا سنا ہے کانپور میں انگریزوں نے توپ بندوق بنانے کا کارخانہ کھولا ہے۔ تم تو یہ کام بخوبی جانتے ہو، اور انگریزی بھی پڑھے ہو۔ اس وقت بھرتی زوروں پر ہے۔ زیادہ پوچھ گچھ نہ ہوگی۔ تم کمہار کے کام کے لیے نہیں بنائے گئے تھے۔ تمھیں اس طرح من مار کر جیتے دیکھ کر میرا جی کڑھتا ہے۔ تمھاری زمینیں ابھی انگریز نے ضبط کر رکھی ہیں۔ جب چھوٹیں گی تو میں تم کو خبر کر دوں گا۔

بات دل کو لگتی تھی۔ تھوڑے ہی دن بعد میں کانپور کے کارخانہ توپ و تفنگ کی بھرتی کے لیے لین ڈوری لگائے کھڑا تھا۔ بھرتی والے صاحب نے اتنا ضرور پوچھا کہ تم نے لڑائی میں کوئی حصہ تو نہیں لیا؟ میں نے سچ سچ جواب دیا کہ بالکل نہیں۔ میں بھرتی ہو گیا اور

تھوڑے ہی دن میں میری کارکردگی کے باعث میری ترقی ہو گئی۔ مجھے کوئی افسر نما چیز بنا دیا گیا اور بتایا گیا کہ آج سے میں "فور مین" ہوں۔ تنخواہ اب معقول ہو گئی تھی۔ میں نے پریڈ کے بازار کے پاس ایک چھوٹا سا گھر ڈھائی روپے مہینے پر لے لیا، ایک ملازم رکھ لیا، اور خالی وقت میں مشغلہ شعر و سخن کرنے لگا۔

اس وقت کانپور میں کوئی نامی اُستاد نہ تھا۔ میاں رجب علی بیگ سرور بنارس جا چکے تھے۔ لکھنؤ سے آغا حجّو شرف کبھی کبھی آنکلتے تھے۔ ورنہ محفلوں میں ہر شخص خود کو اُستاد ہی تصور کرتا تھا۔ میں نے مولوی ناظم صاحب قبلہ کی نصیحت کو گرہ میں باندھ لیا تھا کہ مبتدی کے لیے صفائی بیان ضروری ہے، نہ کہ ندرتِ مضمون۔ لیکن کیا کرتا، میرا دل خیال بندی کی طرف لپکتا تھا۔ شیخ ناسخ اور مرزا نوشہ کا کلام ورد زبان رہتا تھا۔ شیخ صاحب تو اس شبستانِ تیرہ روز کے شب و روز دیکھنے کے پہلے ہی اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ اب مرزا نوشہ تھے اور میری تمنا کہ اُن کی طرح کا شعر کہوں، ان کے پاس اُٹھوں بیٹھوں، کچھ سیکھ کر واپس آؤں۔

مئی ۱۸۶۲ء کی بات ہے۔ ایک دن میں توپ خانہ بازار کی کوتوالی کے سامنے سے گزر رہا تھا کہ نظامی پریس کے مولوی عبدالرحمٰن تیز تیز قدموں سے آتے ہوئے نظر پڑے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ ٹھٹکے، اور بولے، "لو بھئی میاں رسوا، تم مرزا کا نام بہت جپتے رہتے ہو، تم بھی کیا یاد کرو گے۔ میں نے مرزا کا مکمل کلام ریختہ مطبع کیا ہے۔" یہ کہتے ہوئے اُنھوں نے ایک پتلی سی کتاب میرے سامنے کر دی۔ میں نے آخری ورق دیکھا تو واقعی مولوی صاحب کی طرف سے اعلان تھا، اور ان کی مہر تھی، اس امر کے ثبوت میں کہ یہ کتاب اُنھیں کی چھاپی ہوئی ہے۔ لکھا تھا، "جناب مجمع لطف بے کراں محمد حسین خاں صاحب دہلوی نے بعد نظر ثانی اور تصحیح جناب مصنف کی ایک نسخہ میرے پاس بھیجا۔ میں نے بافضال ایزدی مطابق اس نسخے کے شہر ذی حجہ ۱۲۷۸ ہجری مطبع نظامی واقع شہر کانپور میں صحت تمام اور درستی کمال سے چھاپا۔" وغیرہ وغیرہ۔

میں نے بکمال اشتیاق وہ نسخہ ان سے وہیں خرید لیا۔ لیکن شروع کا صفحہ دیکھا تو صحت تمام کے دعوے کے باوجود غلطی نظر آئی، کہ دوسری ہی غزل پر (جس میں صرف ایک شعر

تھا) کوئی نمبر شمار نہ تھا۔ اس طرح غزلوں کی تعداد درست نہ رہ گئی تھی۔ لیکن میں نے مولوی صاحب سے کہا نہیں، کہ بےچارے خفیف ہوں گے۔

اس دن سے دیوان غالب کا وہ نسخہ میرا شب و روز کا ہمدم و دمساز بن گیا۔ جی چاہتا تھا کہ میں اس نسخے کی اشاعت کو مرزا نوشہ سے اپنی رسم و راہ قائم کرنے کا وسیلہ بنالوں۔ لیکن یہ کس طرح ہو، بات سمجھ میں نہ آتی تھی۔ انطباع کے بعد وہ دیوان ہزاروں لوگوں نے دیکھا ہوگا، پھر میری کیا تخصیص تھی؟ اور یہ بات، کہ دیوان کانپور میں طبع ہوا، اور فی الوقت میں بھی کانپور میں تھا، میرے لیے تو ایک دلکش اتفاق ہو سکتی تھی، مگر میرزا صاحب کو اس سے کیا؟

اس ادھیڑ بن میں کوئی ایک مہینہ نکل گیا۔ ایک دن میں نے پریڈ کے میدان کے بازار میں ایک پادری کو دیکھا کہ لوگ اس کے پاس آ آکر کسی کتاب پر اس سے دستخط لیتے ہیں۔ میں کچھ نہ سمجھا کہ یہ کیا اسرار ہے۔ استفسار پہ معلوم ہوا کہ کتاب کا مصنف وہ پادری ہی ہے۔ لوگ اس کی کتاب خرید کر لاتے ہیں اور اس پر اس کے دستخط لے کر گویا اپنی قدر دانی اور محبت کا اظہار کرتے ہیں۔ میرے دل میں یک مرتبہ یہ بات گونجی کہ اگر میں بھی مرزا کے دیوان کے کچھ نسخے خرید کر ان سے دستخط کرالاؤں اور دوستوں کو تحفتاً پیش کروں تو کیسی رہے؟ مرزا سے ملنے کا بہانہ بھی ہاتھ آئے گا، اور دوستوں پر مفت کرم داشتن کا بھی موقع رہے گا۔

پہلا کام تو میں نے یہ کیا کہ چمن گنج میں نظامی پریس جا کر دیوان کی پچیس جلدیں مول لیں۔ قیمت کچھ زیادہ نہ تھی، صرف آٹھ آنے۔ پھر ہر کتاب کو بڑے اہتمام سے مجلد کرالیا۔ ہر جلد پر چھ آنے صرفہ آیا۔ مولوی صاحب نے معمولی مشینی کاغذ پر کتاب چھاپی تھی، لیکن انطباع روشن اور صاف ہونے کی وجہ سے کتاب بھلی معلوم ہوتی تھی۔

ایک مہینہ تو اسی حیص بیص میں گزرا کہ کتابیں لے کر جاؤں بھی یا نہیں۔ کہیں میرزا صاحب برا نہ مان جائیں۔ بہر حال، بعض دوستوں سے مشورہ کر کے فیصلہ کیا کہ جانا چاہیے، لیکن ذرا موسم بدل جائے، ہوا سرد ہو جائے اور سفر آسان ہو جائے۔

چار مہینے میں نے ان مجلدات کو حرزِ جاں کی طرح سینت کر رکھا۔ نومبر ۶۲ ۱۸ء کے

آخری دن تھے جب میں تسبیل ڈاک قنوج، فرخ آباد، بیاور، کول، بلند شہر، غازی آباد، شاہدرہ، ولہائی ہوتا ہوا بیس دن کی مسافت کے ہرج مرج جھیلتا، غم والم اُٹھاتا، دلّی پہنچا۔ میں باڑہ ہندو راؤ کی ایک سرا میں اُترا۔ معلوم ہوا کہ بلی ماروں کا علاقہ یہاں سے کچھ بہت دور نہیں۔ آہنی سڑک ابھی کانپور کے پاس سے بھی نہ گزری تھی، گو کہ اس کے آنے کے غلغلے تھے۔ میں نے بھی اب تک ریل کی سواری کی نہ تھی اور نہ اس کا ارادہ تھا۔ لیکن دہلی کی ریل منزل میری سرائے کے پاس ہی تھی۔ وہاں کی چہل پہل، لوگوں کی دھکا پیل، دھواں دھکڑ، وخان پھینکتے ہوئے آتشیں انجنوں کا آنا جانا (اس لفظ سے میں کانپور میں آشنا ہوا)، مجھے یہ سب کچھ عجب وحشت انگیز سا لگا۔

شام ہو رہی تھی، میں نے دو کباب داغ کروائے، ساتھ میں دو پراٹھے منگوائے، لیکن گھبراہٹ اور تکان سفر کے باعث کچھ کھایا نہ گیا۔ جلدی لیٹ رہا۔ صبح کو بھٹیارن سے استصواب کیا تو اس نے کہا کہ "میاں صاحب، ان نواب اور شاعر لوگوں کا دستور ہے کہ دن چڑھے اُٹھتے ہیں، کچہری دربار جاتے ہیں، بڑے لوگوں سے ملتے ملاتے ہیں۔ شام کو ہوا خوری کو نکلتے ہیں۔ ان سے ملاقات کا سب سے اچھا وقت دن ڈھلے چراغ جلے ہے۔ مرزا نوشہ صاحب کا نام میں نے سنا ہے۔ وہ دتی کے تو ہیں نہیں، ممکن ہے ان کے طرز و طور اور رہے ہوں، لیکن اب تو وہ بھی یہیں کے رنگ میں رنگ گئے ہیں۔ میں نے ایک آدھ بار اُنھیں رجواڑے کی گلی سے سواری میں گزرتے دیکھا ہے۔ تو میاں صاحب ابھی شہر کی سیر یں کرو۔ شام میں ایک مشالچی ملازم اور گھوڑا سیس تمھارے ساتھ کر دوں گی۔ آرام سے مل کر چلے آئیو۔"

شام ڈھلنے کے ذرا پہلے میں نے لباس تبدیل کیا، مچھلی کے چھلکوں کی ٹوپی سر پر جمائی، اس پر رنگین پگڑی باندھی۔ کانوں میں موتی کے بالے ڈالے، ریشمی دھوتی کے نیچے پاؤں میں بانے پہنے، جو دھپوری جوتیاں پہنیں۔ پھر ساز سینگڑا لگا کر اپنے دادا مرحوم کی بنائی ہوئی کٹھر کاندھے سے لٹکائی۔ میں اپنے قریبی قصبے مبارک پور سے مرزا صاحب و قبلہ کے لیے دو ریشمی لنگیاں اور دو ہی ریشمی پگڑیاں بطور خاص بنوا لایا تھا۔ میرے وطن نظام آباد کی مٹی

کے کچھ برتن، مثلاً چلمیں اور فرشیاں بھی تھیں۔ ان کو خوان پر رکھوایا، اسی پر کتابیں بھی رکھ کر سئیس کے حوالے کیں۔ مشالچی کو آگے کیا اور خود گھوڑے پر سوار ہو کر چلا۔

اس وقت تک شام اچھی طرح پھول چکی تھی۔ اندھیاری کی بنا پر گری پڑی حویلیوں اور لٹے ہوئے بازاروں کے منظر پر ایک ذرا پردہ سا آ گیا تھا۔ جامع مسجد پر بے فکروں اور چتوروں کا مجمع ویسے ہی تھا۔ افسوس کہ میرا سئیس اور مشالچی دونوں ہی میواتی تھے، اور دتی میں نووارد۔ وہ بار بار راہ کھوٹی کرتے اور شہر کی تبدیلیوں پر الزام دھرتے۔ میرا سئیس خاص کر بڑا باتونی تھا۔ ''میاں صاحب، رستہ اب کسے بجھائی دوے ہے، اور بجھائی بھی دوے تو کیسے؟ مسجد سے راج گھاٹ تک اب لق و دق صحرا ہے۔ اینٹوں کے ڈھیر ہیں اور ان کے اندر سانپ بچھوؤں کے مسکن۔ مرزا گوہر صاحب عالم کے باغ کی نچلی سمت کئی بانس نشیب تھا۔ اب وہ بھیچ کی چاندنی کے برابر ہو گیا۔ آہنی سڑک کے واسطے کشمیری دروازے سے لے کر کابلی دروازے تک میدان ہی میدان ہے۔ پرانی گلیاں لوگوں سے اٹی پڑی ہیں، راستے کھو گئے ہیں۔ اگلا جائے تو کہاں جائے؟ پنجابی کٹرا، دھوبی واڑا، سعادت خان کا کٹرا، یہ اور اس طرح کے کتنے ہی محلے مٹ گئے۔ گلیوں کی شکلیں بدل گئیں۔ میاں صاحب، اب یہ دتی دتی نہیں، ایک کیمپ ہے، بارک ہے، اُجاڑ گھروں کا جنگل ہے۔ حضرت مرزا ابو ظفر سراج الدین بہادر شاہ کے زمانے میں یہ سب گلیاں اور بازار روشنی سے جھکا جھک تھے۔ اب ہاتھ کو ہاتھ بجھائی نہیں دیتا۔'' مجھے مرزا صاحب کا قطعہ یاد آ گیا جو انگریز کے ڈر سے ہنوز مطبوع نہ ہوا تھا لیکن شدہ شدہ لوگوں کی زبانوں پر جاری ہو گیا تھا:

گھر سے بازار کو نکلتے ہوئے
زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے
گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا

اور آج کی دتی کے بارے میں اپنے وقت کے ابلغ البلغا، اشعر الشعرا، خدائے سخن حضرت

میر تقی کے کئی شعروں میں سے یہ شعر ذہن سے پھسل کر بے ساختہ زبان پر آرہا:

اب شہر ہر طرف سے میدان ہو رہا ہے
پھیلا تھا اس طرح کا کاہے کو یاں خرابا

میں نے دل میں کہا ایشور کرے کبھی دتی کے بھی دن پھریں۔ اِی جی ہو۔ تخت پر وہی براجے جس کا حق ہے۔

انھیں سب باتوں، راستہ ڈھونڈنے اور ٹھوکریں کھانے میں دو گھنٹے صرف ہو گئے۔ مجھے خفقان ہو رہا تھا کہ مرزا صاحب بستر استراحت پر نہ تشریف لے گئے ہوں۔ اگر میری خبر پر اُنھیں اُٹھنا پڑا تو بڑی شرمندگی کی بات ہوگی۔ اِدھر وہ مشالچی اور سئیس اتنے احمق کہ اُنھیں کالے صاحب کا احاطہ ہی مل کے نہ دیتا تھا۔ مرزا صاحب کی حویلی کا ایک دروازہ عالم خاں کے کٹرے کی طرف کھلتا تھا اور ایک کالے صاحب کی مسجد کی طرف۔ صدر دروازہ کالے صاحب کی خانقاہ سے ملا ہوا تھا۔ بارے خانقاہ کا پتا ملا تو حویلی بھی نظر آئی۔ ایک دو ملازموں کو باہر استادہ دیکھ کر جان میں جان آئی کہ ابھی لوگ موجود ہیں۔

اطلاع کرائی تو فوراً ہی بلوا لیا گیا۔ دو حضرات پہلے سے موجود تھے۔ مرزا صاحب کا شغل شروع ہو چکا تھا، شاید حضارِ مجلس سے کسی قسم کا پردہ نہ تھا۔ ہائے میں مرزا صاحب کی شکل کیا بیان کروں۔ کشیدہ قامت، متوسط بدن، لیکن ہاڑ بہت چکلا، شانے اس عمر میں بھی خم سے آزاد۔ سنہرا چمپئی رنگ، اس پر سفید ڈاڑھی، سر منڈا ہوا۔ مسکراتا ہو روشن چہرہ، آنکھیں بڑی بڑی لیکن تھوڑے سے سرور کی وجہ سے سرخی مائل۔ آنکھوں میں شوخی اور فراست کی چمک۔ پورا چہرہ مہرہ اور قد و قامت بالکل کسی تازہ وارد تورانی کا تھا، بس ڈاڑھی ہندی طرز کی نہ ہوتی اور سر نہ منڈا ہوا ہوتا تو اچھے اچھوں کو یہی دھوکا ہوتا کہ کوئی آغائے تورانی ہے۔ ساری ڈاڑھوں کے گر جانے کے باعث دونوں گال ذرا پچک گئے تھے۔ یہ ایک کمی نہ ہوتی تو پیرانہ سری کے باوجود وجاہت و حسانت مردانہ کا بہترین نمونہ قرار پاتے۔ آواز ان کی نہایت صاف اور کھلی ہوئی تھی۔ اکبر آبادی برج کی لچک اور مٹھاس لہجے میں اب بھی تھی، لیکن اس پر دتی کی کرخت بولی کی گہری تہ جم چکی تھی۔ میں نے دل میں کہا کہ یہ لوگ میری

پوربی، بھوج پوری کا ہلکا سا رنگ لیتی ہوئی آواز اور زبان کو بھلا کیا خیال کرتے ہوں گے۔
اور کیا خلق عظیم تھا، کیا شفقت تھی۔ اُنھوں نے لب فرش تک آکر میرا استقبال کیا۔ اپنے دست چپ پر بٹھایا۔ دست راست پر جو صاحب بیٹھے تھے، ان کا لباس مغل منصب داروں کی طرز کا تھا۔ بڑے گھیر کا جامہ، اس کے نیچے قیمتی کپڑے کا زیرِ جامہ۔ کمر میں ریشمی دوپٹہ، جس سے خنجر جواہر نگار دآب دار آویزاں۔ سر پر زربفت کی بیچ گوشیہ ٹوپی، جو مغل طرز سے ذرا مختلف تھی۔ ڈاڑھی موچھیں گھنی، موچھیں چڑھی ہوئی، نکیے دار۔ ڈاڑھی بڑی صفائی سے ذرا چوکور سی ترشی ہوئی۔ داہنے ہاتھ کی انگشت شہادت میں ایک بہت بڑی زمرد کی انگوٹھی، غالباً مہر نگیں کے کام آتی ہو گی۔ فاصلے کے باوجود نگینے پر کچھ کندہ کیا ہوا صاف دکھائی دیتا تھا۔ انتہائی خوبصورت اور وجیہہ انسان تھے۔ معلوم ہوا نواب ضیاء الدین خان صاحب نیرّ درخشاں ہیں۔ میں نے سر و قد ہو کر تعظیم دی۔ اُنھوں نے مسکرا کر سلام لیا اور دعا دی، ''خوش رہیں، آباد رہیں۔ دولت و اقبال زیادت باد۔''
جو بزرگ مرزا صاحب کے سامنے تشریف فرما تھے ان کی ڈاڑھی موچھیں بہت گھن کی تھیں، کنگھی کی مشاطگی سے آزاد، بالکل چڑیا کا جھونجھ لگتی تھیں۔ سر پر اونچی دیوار کی مخملی ٹوپی، بدن پر انگریزی وضع کا بھاری کوٹ، نیچے موٹا اونی کرتا، اسی کپڑے کا ڈھیلا پاجامہ۔ متبسم آنکھیں۔ معلوم ہوا کہ مرزا صاحب کے خاص شاگرد منشی شیو نرائن آرام ہیں۔ آگرے سے بغرض ملاقات وعلاج تشریف لائے ہیں۔ میں نے پھر سر و قد ہو کر تعظیم دی۔ اُنھوں نے بھی تقریباً اُنھیں الفاظ میں دعا دی جو نواب ضیاء الدین صاحب کی لسان مبارک سے ادا ہوئے تھے۔

مرزا صاحب نے فرمایا، ''میاں، خانۂ بے تکلف ہے، بتاؤ کچھ شغل بھی رکھتے ہو؟''
میں نے دبی زبان سے جواب دیا۔ ''حضور، راجپوت ہوں، برت بھی دو آتشہ تاب سے کھولتا ہوں۔''
مرزا صاحب کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔ شیو نرائن صاحب آرام نے تحسین کی نگاہ سے مجھے دیکھا۔ نواب صاحب نے ارشاد فرمایا:

"میاں صاحب زادے، یہ تو تم نے ہمارے قبلہ مرزا صاحب کا شعر پڑھ دیا۔"
میں بات کو بھانپ گیا کہ اشارہ کس طرف ہے اور میں نے فوراً مرزا صاحب کا شعر پڑھا:

خجلت نگر کہ در حسناتم نہ یافتند
جز روزۂ درست بہ صہبا کشودۂ

پھر میں نے ہاتھ جوڑ کر عرض کی، "پیر و مرشد کی کرامت ہے کہ ایسا جواب بن پڑا۔ پیر و مرشد لسان الغیب کا درجہ رکھتے ہیں۔"

اس پر سب لوگوں نے کہا "بے شک، بے شک۔"

مرزا صاحب نے کلو دار وغہ کو آواز دے کر میرے لیے گیلاس اور نقل منگوائی۔ پھر غایت سفر پوچھی۔ میں نے مختصر اً عرض کر کے سب سے پہلے تو وہ لنگیاں اور پگڑیاں نذر کیں۔ میری خوش نصیبی تھی کہ پگڑیاں ان کی پسند کے مطابق نکلیں۔ اُنھوں نے فرمایا، "بہت خوب، بہت خوب۔ مجھے عمامے میں سرخ رنگ بالکل پسند نہیں۔ اچھا ہوا ان عماموں میں کوئی بھی سرخ دھاگا نہیں ہے۔" میں نے جھک کر تسلیم کی، پھر چلمیں اور فرشیاں پیش کیں۔ بالکل سیاہ مٹی، اس پر رو پہلا کام بنا ہوا۔ یہاں والوں کے لیے نئی چیز تھی، بہت پسند کی گئی۔

نواب صاحب اور منشی صاحب تو رخصت ہوئے، میں مرزا صاحب قبلہ کے ساتھ شغل مے دینا کرتا رہا۔ کوئی انگریزی شراب تھی، بالکل بے رنگ، اور بہت تیز۔ غالباً شامپین رہی ہو۔ رات جب بہت بھیگ چلی تو میں نے اجازت چاہی۔ فرمایا:

"دیر ہوتی ہے، جاؤ بھئی جاؤ۔ میں بھی کچھ سخن فکر کروں گا۔ ہے ہے، مجھے اپنی جوانی کا شعر یاد آگیا:

فکر سخن یک انشا زندانی خموشی
دودِ چراغ گویا زنجیر بے صدا ہے

لیکن اب میں بھی زیادہ جاگتا نہیں۔"

میں نے ڈرتے ڈرتے عرض کی:

"حضور، جب اس کلام میں ایسے ایسے شعر تھے تو اس پر خط تنسیخ پھیرنا کیوں گوارا کیا؟"
جیسے ایک دم کو وہ چپ ہو گئے۔ میں ڈرا کہ ناراض نہ ہو گئے ہوں۔ لیکن پھر وہ کچھ دھیمے لہجے میں بولے، "میاں، اس بڑھاپے میں اقبال کرتے شرم آتی ہے، لیکن اس کلام کو رد کرنے کا رنج مجھے بھی ہے۔ کہنے تو میں کہہ گیا کہ میں لڑکپن میں بے راہ رو تھا۔ بے مطلب بکتا تھا۔ جب کچھ تمیز آئی، وہ اوراق یک قلم چاک کیے اور چند شعر واسطے نمونے کے دیوان حال میں رہنے دیئے۔ لیکن اصل بات سلامت روی فکر اور سلاست بیان کی نہ تھی۔ میری نوجوانی تھی، میں سمجھتا تھا کہ شعر، سننے سنانے سے زیادہ، پڑھنے پڑھانے کی شے ہے۔ پھر مرزا عبد القادر بیدل کا قول دل میں جاگزیں تھا کہ زبان اور معنی میں مغائرت ہے، زبان کو معنی کا تحمل نہیں۔ مرزا بیدل فرماتے ہیں:

اے بسا معنی کہ از نامحرمی ہاے زباں
با ہمہ شوخی مقیم پردہ ہاے راز ماند

لیکن میں نے دیکھا کہ ہمارے یہاں شعر سننے کا رواج زیادہ ہے، پڑھنے کا کم۔ اور زبان کو میرے معنی سے یوں ہی پردہ تھا۔ میں بات اشاروں اشاروں میں کہتا تھا کہ اس کے سوا چارہ نہ تھا۔ ایک دن طبیعت جھنجھلا ہی تو اٹھی۔ میں نے دل میں کہا اب ریختہ کہوں گا ہی نہیں، فارسی لکھوں گا۔ دوستوں کو خوش کرنے کے لیے اعلان کر دیا کہ ریختہ زیادہ تر مسترد کر کے صرف منتخب اور آسان کلام داخل دیوان کروں گا۔ حالانکہ جو کلام چھوڑ دیا تھا، اس میں بھی نام نہاد آسان کلام کی کمی نہ تھی۔ انتخاب کیا گیا، بس ایک دو پہر کو ایک دوست کے یہاں بیٹھے بیٹھے کچھ سرخوشی کے عالم میں جہاں چاہا قلم لگا دیا۔ ورنہ جن غزلوں پر یہاں لوگوں نے مجھے اُستاد مانا، وہ بھی زیادہ تر اس زمانے کی کہی ہوئی ہیں جب میری عمر پچیس سے متجاوز نہ تھی۔

"اب اس کلام کی بازیافت کی کوئی امید نہیں؟" میں نے پوچھا۔ فرمایا، "مجھے اپنا کلام بہت کم یاد رہتا ہے۔ تازہ کلام بھی بھول جاتا ہوں۔ اور ان اشعار سے تو اب قیامت ہی میں ملاقات ہو گی۔"

میں نے ازراہِ شوخی میر کا شعر پڑھ دیا:

قیامت کو جرمانہ شاعری پر
مرے سر سے میرا ہی دیوان مارا

مسکرائے، فرمایا، "تو آپ بھی میری طرح میری ہیں۔ اوروں کی طرح سودائی نہیں۔"
میں نے اس پھڑکتے ہوئے فقرے پر سبحان اللہ کہا اور عرض کیا۔ "اب اجازت مرحمت ہو۔
اور کیا یہ ممکن ہے کہ پیر و مرشد مجھے کسی ایسے وقت طلب فرمائیں جب تخلیہ ہو؟" اصل میں
مجھے کتابوں پر دستخط کی فرمائش کی ہمت نہ پڑ رہی تھی۔ اُمید تھی کہ رات بھر میں ہمت
جٹالوں گا۔

کچھ دیر سکوت کے بعد فرمایا، "اچھا تو میاں تم کل دوپہر کا کھانا یہیں کھاؤ۔ اس کے بعد
میں ذرا لیٹ رہتا ہوں، کسی کو آنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ تمھارے لیے وہی وقت نکال لوں
گا۔"

مجھے کچھ اور کہنے کی ہمت نہ پڑی، حالانکہ ان کے آرام میں خلل انداز ہونا سخت شاق
تھا۔ آداب کر کے سرائے واپس چلا آیا۔

اگلی صبح طبیعت کسل مند تھی، دیر سے اُٹھا۔ تیار ہوتے ہوتے بارہ بج گئے۔ میں تہا ہی
سوار ہو کر بلی ماروں کو چلا۔ راستے میں ہر جگہ گزشتہ جز نیلی نظام کی دردناک نشانیاں اور آہنی
سڑک کے واسطے مزید انہدام کی تیاریاں نظر پڑیں۔ میں نگاہ جھکائے چلا گیا۔ اس بار راستہ نہ
بھولا۔ مرزا صاحب کمال شفقت سے میرے منتظر تھے۔ میرے جاتے ہی کھانا لگا۔ مرزا
صاحب کے لیے اتنا کم اور سادہ کہ بقدر اشکِ بلبل، اور میرے لیے وافر اور متنوع۔

کھانے کے بعد پیر و مرشد نے انگنائی میں دھوپ سے ذرا ہٹ کر اپنا پلنگ بچھوایا،
میرے لیے ایک چھوٹی سی صندلی بچھائی گئی۔ بھنڈا تازہ کیا گیا۔ مرزا صاحب اپنا پیچوان کبھی
کبھی مجھے اولوش فرماتے۔

جب بھنڈے کا لطف لے چکے تو مرزا صاحب نے فرمایا، "ہاں صاحب، اب کہو، اب
تخلیہ ہے۔" میں نے کتابوں کی گٹھری کھولی، اور ایک کتاب ان کی طرف بڑھا کر کچھ کہنے ہی

والا تھا کہ اُنھوں نے کتاب کھول کر کہا، "یہ تو میرا ہی دیوان ہے۔ میں اسے لے کر کیا کروں گا؟"

میں نے عرض کیا، "اس کی حاضری کا مقصد کچھ اور ہے۔ ملتمس ہوں کہ حضور ان مجلدات کو اپنے دستخط سے مزین فرمادیں۔ میں انھیں نذرِ دوستاں کردوں گا، اس سے بہتر تحفہ دلّی کا کیا ہوگا۔"

"مگر بھائی، میں دستخط کیوں کروں؟ یہ کتابیں میری ملک تو ہیں نہیں۔"

میں نے التماس کیا۔ "صاحبانِ عالیشان کے یہاں یہ طریقہ مصنف کی قدرشناسی کا رائج ہے کہ کتاب پر مصنف ہی سے دستخط کرا لیتے ہیں اور اسے بڑا قیمتی تحفہ قدردانوں کے لیے جانتے ہیں۔"

مرزا صاحب ہنسے، ارشاد ہوا۔ "ہم تو یہ جانتے تھے کہ مصنف کی قدردانی ظاہر کرنے کے لیے اسے سات بلکہ چودہ پارچے کا خلعت پہناتے ہیں، اکیس رقوم جواہر کی مالا اور سات عدد کا جیغہ زیبِ گردن و سر کرتے ہیں۔ نصف روپے کی کتاب مول لے کر اس پر مصنف کے دستخط لینا اور کتاب تقسیم کرنا کون سی قدرشناسی ہے۔ خیر لاؤ، تم کہتے ہو تو اپنی مہر کیے دیتا ہوں۔

حسن اتفاق کہ ابھی ۱۲۷۸ھ میں نئی مہر بنوائی ہے۔" یہ کہہ کر اُنھوں نے داروغہ کلو سے قلم دان مانگا، ہر کتاب پر اپنے دستِ مبارک سے مہر کی۔ چاندی کے نگینے کی چوکور مہر تھی۔ پھر کچھ سوچ کر ایک کتاب پر لکھا:

برخوردار بینی مادھو سنگھ رسوا

اے آمدنت باعث دل شادی ما

اسد اللہ خان غالب نگاشتہ ۱۶ رجب المرجب ۱۲۷۹ھ

کتاب میری طرف بڑھاتے ہوئے وہ بولے، "اب تو خوش ہو۔" میں نے سرو قد ہو کر کتاب ان کے ہاتھ سے لی، آنکھوں سے لگائی۔ ان کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور اجازت چاہی کہ آرام میں مخل نہ ہوں۔ ارشاد ہوا، "کوئی بات نہیں۔ بیٹھو۔ مجھے تمھارا لہجہ اچھا لگتا ہے۔ اور تم

نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ شعر کب سے کہتے ہو۔ صاحب دیوان ہو کہ نہیں اور کس کے شاگرد اس فن میں ہو؟"

میں نے اپنے استاد مولوی خادم حسین ناظم اور ان کے داد املا سابق بنارسی کا ذکر کیا۔ فرمایا، "مولوی ناظم صاحب سے تو شرف ملاقات نہیں، لیکن ملا سابق علیہ الرحمۃ سے واقف ہوں۔ ان کی مثنوی "تاثیر محبت" میں نے اپنے بنارس کے قیام میں دیکھی تھی۔ بڑے جید آدمی تھے۔"

میں ان کی خدمت میں کچھ گستاخ ہو چلا تھا، شاید اس لیے کہ اُنھوں نے مجھے کچھ منہ بھی لگا لیا تھا۔ میں نے عرض کیا۔

"پیر و مرشد، جان کی امان پاؤں۔"

ایک بار مجھے اُنھوں نے غور سے دیکھا، فرمایا، "کہو کہو، کیا بات ہے؟"

میں نے جی کڑا کر کے کہا۔ "حضور کی رائے ہندوستانی فارسی گویوں کے بارے میں اچھی نہیں ہے۔ لیکن آنجناب تو خود بھی ہندوستانی ہیں؟"

اُن کا چہرہ تھوڑا سرخ سا ہو گیا، لیکن پھر بھی اُنھوں نے نرمی سے فرمایا، "فارسی زبان کے رموز و غوامض میری روح میں یوں پیوست ہیں جیسے فولاد میں جوہر، یا رگ گل میں باد سحر گاہی کا نم۔ میں کہاں اور یہ غیاث الدین رامپوری اور دلوالی سنگھ قتیل فرید آبادی کہاں۔ ان کے اجداد نے بھی کبھی ایران نہ دیکھا ہوگا۔"

"لیکن حضور اور بھی تو ہندی شعرا ہیں۔ امیر خسرو، ملا فیضی، ملا غنی کاشمیری، ابو البرکات منیر، یہ لوگ تو غیاث و قتیل جیسے نہیں۔"

اب ان کے لہجے میں ذرا گرمی آگئی۔ "اہل ہند میں سوائے امیر خسرو کے کوئی مسلم الثبوت نہیں، سمجھے؟ میاں فیضی کی بھی کہیں کہیں ٹھیک نکل جاتی ہے۔ ہاں غنی اور منیر اور خود فیضی اچھے شاعر ہیں، معنی یاب ہیں، لیکن زبان سے ان کو کیا علاقہ؟"

میرے جی میں آئی، پوچھوں کہ زبان اور مضمون تو ایک دوسرے کے تابع ہوتے ہیں، پھر یہ کیوں کر ہوا کہ کوئی معنی یاب ہو لیکن زبان، خراب لکھے۔ مگر اتنی بڑی گستاخی کی ہمت نہ

تھی۔ میں نے سوچا بیدل کے پروے میں بات کریں۔ کل بیدل کا ذکر آ بھی چکا تھا۔ میں نے کہا، "حضور ایک زمانے میں تو میرزا بیدل کے بڑے مداح تھے۔۔۔"

میری بات کاٹ کر بولے، "مداح اب بھی ہوں، لیکن ان کی زبان کا نہیں۔ بیدل اور ناصر اور غنیمت، ان کی فارسی کیا۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔" انھوں نے کلیان کو آواز دی کہ بھنڈا دوبارہ تازہ کرو۔ میں نے رکتے رکتے عرض کی، "ڈرتا ہوں جس طرح حضور ان شعراکو ایوان شعر سے خارج فرمارہے ہیں، کہیں آپ کے ساتھ بھی زمانہ وہی سلوک نہ کرے۔"

یا تو لیٹے ہوئے تھے، یا مرزا صاحب اُٹھ کر بیٹھ گئے۔ فرمایا، "یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ فارسی زبان کی زمام میرے ہاتھ میں ہے، طبع میری سلیم ہے اور ذوق میرا درست۔ اور میرے مضامین تو ایسے ہیں کہ لوگ انھیں رہتی دنیا تک پڑھتے اور سمجھتے پھریں گے۔ ابھی یہ اہل ہند کیا جانیں گے اور کیا سمجھیں گے۔"

پھر انھوں اپنا شعر پڑھا:

پایۂ من جز بہ چشم من نیاید در نظر
از بلندی اخترم روشن نیاید در نظر

خدا کی قسم، وہ وقت اور وہ ماحول، وہ اُن کے چہرے پر بادشاہوں کا سا جلال۔ اور مضمون کی وہ ندرت، کلام کا وہ زور، میں پھڑک ہی تو گیا۔ (اس واقعے کے برسوں بعد کسی انگریزی اخبار میں دیکھا کہ بہت سے ستارے ہم سے اتنی دور ہیں کہ ان کی روشنی ہم تک، بہت دھندلی، اور بہت دیر میں پہنچتی ہے، درحالے کہ اصل میں وہ بے حد چمک دار ہیں۔ تب مجھے ان کا یہ شعر یاد آیا۔ میں نے دل میں کہا، ہے بھگوان، کیا مرزا صاحب کو علم غیب تھا جو ایسے مضمون باندھ لیتے تھے)۔ لیکن اس وقت تو مجھے ان کو چھیڑنا اور ان سے کچھ سیکھنا منظور تھا۔ دل کھول کر اس شعر کی داد دینے کے بعد میں نے کہا، "قبلہ وکعبہ، غنی کے تو میرزا صائب بھی قائل تھے۔"

"اجی صاحب زادے، صائب کیا اور ان کا فیصلہ کیا؟ اہلِ ہند کے درمیان رہتے رہتے ان کی زبان خود غیر معتبر ہو گئی تھی۔ وہ ایرانی نژاد تھے مگر وارد شاہجہان آباد تھے۔ "انتقام کشیدن"

اور "انتقام گرفتن" دونوں بول گئے۔ "انتقام گرفتن" ترجمہ ہے ہندی محاورے "انتقام لینا" کا۔ فارسی میں غلط، بالکل غلط۔"

"مگر پیر و مرشد، اگر صائب کی زبان مشکوک ہے تو عرفی کو کیا کہیں گے؟ انھوں نے بھی تو عمر کا بڑا حصہ اکبر آباد میں گزارا؟"

"ہے ہے۔ عرفی کا نام تم کیوں بیچ میں لائے۔ وہ ہمارا مطاع ہے، ہم اس کے مطیع ہیں۔ وہ جو بھی کہے سب درست۔"

میں نے مدرسے میں جو تھوڑی سی منطق پڑھی تھی اس کی رو سے قبلہ و کعبہ کی یہ بات مجھے صریحاً غلط معلوم ہوتی تھی۔ لیکن مجھے ان سے مناظرہ تو کرنا نہیں تھا، کچھ حاصل ہی کرنا تھا۔ لہٰذا میں نے کہا، "حضرت، خان آرزو تو فرماتے تھے کہ جس طرح ایرانی صاحبان قدرت کو زبان میں تصرف کا حق ہے، اسی طرح ہندوستانی صاحبانِ قدرت کو بھی ہے۔"

"مگر اہلِ ہند میں صاحبانِ قدرت ہیں کہاں؟ کیا تم قتیل کو صاحبِ قدرت کہو گے جو 'ہمہ جا، ہمہ عالم' کو غلط بتاتا ہے اور 'ہیچ نہ بود' کی جگہ ریختہ کا محاورہ 'خاک نہ بود' لکھتا ہے؟"

"حضرت، اہلِ ہند میں اور بھی لوگ ہیں۔ اگر امیر خسرو اعلی اللہ مقامہ 'مسلم الثبوت ہو سکتے ہیں تو بیدل کیوں نہیں؟ اہلِ ہند پانسو برس سے فارسی لکھ بول رہے ہیں، کیا ان کی فارسی اپنی جگہ مستند نہ مانی جائے؟ آخر سب ایرانی اُستاد بھی تو شیراز و اصفہان کے نہ تھے۔ کوئی بلخی ہے، کوئی غزنوی، کوئی بخاری، کوئی گنجوی۔"

"دیکھو دنگا کرنے کی بات اور ہے۔ ورنہ سید ھی خدا لگتی یہی ہے کہ اہلِ ہند کو فارسی نہیں آتی۔ میرا معاملہ اور ہے۔ اس زبان سے ازلی و وہبی مناسبت کے علاوہ میرا تو ایک ایرانی اُستاد بھی تھا جس نے مجھے یہ زبان گویا گھول کر پلا ہی دی تھی۔"

اتنا کہہ کر وہ آنکھ بند کر کے لیٹ گئے۔ شاید تھک گئے ہوں۔ مجھے یہ بھی خیال ہوا کہ شاید میں حد سے آگے نہ بڑھ گیا ہوں۔ میں اجازت کے لیے اُٹھنے ہی والا تھا کہ اُنھوں نے آنکھیں بند کیے کیے فرمایا:

"اہلِ ہند کی فارسی پر ان کی اپنی زبانوں کا اثر لامحالہ پڑا ہے، خواہ ہندی، خواہ بھاکا۔ اس

لیےان کی فارسی میں ایرانیت نہیں۔"

"لیکن حضرت والا یہ بھی تو خیال فرمائیں کہ جس قوم نے خسرو، فیضی، غنی، بیدل، بہار جیسے لوگ پیدا کیے ہوں،اس کا بھی تو فارسی زبان پر حق ہوگا؟" میں نے ذرا زور دے کر کہا۔

"تم ان باتوں کو نہ سمجھو گے۔ بہار نے خان آرزو کی تحقیق پر سو جگہ اعتراض کیا ہے، اور صحیح کیا ہے۔ لیکن جہاں وہ بھی اپنے قیاس پر جاتا ہے، منھ کی کھاتا ہے۔ اہل زبان کے معاملات اہل زبان ہی سمجھ سکتے ہیں۔"

"گستاخی معاف، پیر و مرشد میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ بہار اور برہمن اور بیدل جو دن رات فارسی بولتے لکھتے اور سوچتے تھے، انھیں اہل زبان کہنا چاہیے۔ میں اپنا خدشہ پھر عرض کروں گا کہ حضرت والا اگر اہل ہند کی فارسی کو برا کہتے رہے تو مبادا لوگ آپ کی بھی فارسی کو غیر معتبر کہہ دیں۔"

اُنھوں نے لمبی سانس لی اور بولے، "آخر بچے ہو، اور راجپوت بچے ہو۔ تمھاری ضد کا علاج میرے پاس نہیں۔ اب جاؤ، میں کچھ دیر آرام کروں گا۔"

میں سر سے پاؤں تک لرز گیا اور اُٹھا کہ میں نے اس فرشتہ خصال بزرگ کو خفا کر دیا۔ میں نے اُن کے پاؤں پکڑ لیے اور سر جھکا کر کہا، "یہ نیچہ حاضر ہے۔ اسے میرے سینے میں اتار دیجیے لیکن للّٰہ خفا نہ ہوجیے۔"

مرزا صاحب نے تقریباً سرگوشی کے انداز میں کہا، گویا اپنے آپ سے مخاطب ہوں۔ "خفگی کی کوئی بات نہیں۔ ہاں، مومن خاں کیا خوب کہہ گیا ہے:

ناتوانی سے دم رُکے تو رُکے
میں کسی سے خفا نہیں ہوتا

"میاں صاحب، میں خفا نہیں ہوں۔ اپنی تقدیر پر افسردہ ہوں کہ اس دیار سے، اس ملک سے، فارسی کا ذوق اُٹھتا جاتا ہے:

"غالب سوختہ جاں را چہ بہ گفتار آری
بہ دیارے کہ نہ دانند نظیری ز قتیل"

مجھ سے کچھ جواب نہ بن پڑا، بس دل ہی دل میں خود کو بُرا بھلا کہہ رہا تھا کہ میں نے بے سبب ان کو افسردہ کیا۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد اُنھوں نے فرمایا۔ "ہاں مومن خاں کچھ ہمارا ہم زباں تھا۔ اس کا ہندی شعر اس وقت خوب یاد آیا۔ یہ شخص اپنی وضع کا اچھا کہنے والا تھا۔ طبیعت اس کی معنی آفریں تھی۔ اچھا میاں تم اب جاؤ۔ فرصت ہو تو کل بھی اسی طرح آجانا۔"

میں "بسر و چشم حاضر ہوں گا" کہہ کر رخصت تو ہوا، لیکن راستے بھر خود کو نفرین کرتا رہا کہ میں مرزا صاحب سے بحث میں کیوں اُلجھا۔ دوسری طرف یہ سوچ کر بھی میں کم رنجیدہ نہ تھا کہ مرزا صاحب جیسا روشن دماغ شخص اس بات کو قبول کرنے پر آمادہ نہ تھا کہ جب کوئی زبان اپنے ملک کے باہر پھیلتی ہے اور غیر ملک والے مدت مدید تک اس میں سلسلۂ شعر و نثر و حرف و سخن جاری رکھتے ہیں تو غیر ملکیوں کی زبان، اور غیر ملک سے آئی ہوئی زبان میں تغیر لازمی ہے۔ اور کسی ملک میں جب کوئی غیر زبان قائم ہو جاتی ہے تو پھر وہ اس ملک کی بھی ہو جاتی ہے۔ آخر انگریزی بھی تو ہے کہ ہمارے ملک میں تیزی سے مستولی ہوتی جاتی ہے۔ اگر یہی لیل و نہار رہے تو سو دو سو برس میں ہندوستانی لوگ بھی انگریزی میں صاحب قدرت ہو جائیں گے۔

رہی دوسری بات، کہ بیدل، غنی وغیرہ کو تسلیم نہ کر کے مرزا صاحب قبلہ اپنی بھی نامعتبری کی بنیاد قائم کر رہے تھے، تو میں ذرا آگے کی بات یہیں بیان کر دوں کہ ان واقعات کے کئی برس بعد میرے دادا اُستاد مولانا فاروق چریاکوٹی کے براہ راست اور بڑے ہونہار شاگرد مولوی شبلی صاحب ہوئے۔ اُنھوں نے شعر فارسی کی تاریخ پانچ جلدوں میں لکھی۔ یہ جلدیں ۱۹۰۹ء تا ۱۹۱۸ء شائع ہوئیں۔ (آخری جلد ان کے انتقال کے بعد چھاپے خانے سے آئی)۔ میں نے بڑے شوق سے وہ جلدیں عندالاشاعت منگائیں کہ دیکھوں ان میں ہمارے میرزا صاحب کے بارے میں کیا لکھا ہے۔ لیکن مجھے بڑی مایوسی ہوئی کہ وہاں میرزا صاحب تو کیا، بیدل اور غنی اور سرخوش اور خان آرزو کا بھی ذکر نہیں۔ میں نے یہ بھی سنا کہ شبلی صاحب کی نظر میں میرزا غالب وغیرہ مستند نہ تھے۔

دوسرے دن میرزا صاحب کے وہاں جانے کے لیے میں فتح پوری کے بازار فواکہ سے گزر رہا تھا کہ دیکھا سارا بازار کابل کے عمدہ انگوروں سے پٹا پڑا ہے۔ میں نے ایک بڑی جھابی انگوروں کی مزدور کے سر پر رکھوائی۔ مرزا صاحب کی طبیعت اس وقت بحال نظر آئی۔ شاید وہ خفیف سا تکدر، جو میری بحثا بحثی سے پیدا ہوا تھا، زائل ہو چکا تھا۔ انگور دیکھ کر وہ خوش تو بہت ہوئے، لیکن ان کا مرغوب میوہ اور ہی بات رکھتا تھا۔ فرمایا:

"بہت عمدہ پھل لائے۔ بچوں کے کام آئیں گے۔ ایک دو دانے میں بھی کھا لوں گا۔ لیکن کاش کہ ہر موسم آم کا موسم ہوتا۔ میں نے اپنی مثنوی میں کہا ہے:

آم کے آگے پیش جاوے خاک
پھوڑتا ہے جلے پھپھولے تاک

اس میں اور شعر بھی مزے کے ہیں۔" میں ابھی اس شعر کی مناسبتوں اور حسن تعلیل کی داد کے لیے منہ کھولنے ہی والا تھا کہ مرزا صاحب نے فرمایا، "اور میں انگور تو مفتی آزردہ وغیرہ جیسوں کو کھلاتا ہوں۔ کچھ سمجھے کیوں؟"

امتحان ٹیڑھا تھا، لیکن ماں سرسوتی نے لاج رکھ لی۔ معاً میں نے مرزا صاحب کا شعر پڑھا:

زاہد از ما خوشۂ تاکے بچشم کم مبیں
ہی نمی دانی کہ یک پیمانہ نقصاں کردہ ایم

اللہ ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، میرزا صاحب مسکرائے، فرمایا: "آدمی خوش ذوق ہو تو تمھارے جیسا ہو۔ شام کو آتے تو میں تمھیں لیکور پلاتا، کہ اس کا لطف بھی آم ہی جیسا ہوتا ہے۔ رنگت کی بہت خوب، قوام کی بہت لطیف، طعم کی ایسی میٹھی جیسے قند کا پتلا قوام۔ اور یہ ہندوستانی گڑ چھال کی چھنی ہوئی شراب مجھے بالکل پسند نہیں۔"

["لیکور" کسی خاص شراب کا نام نہیں۔ ہر وہ شراب جس میں الکحل ہو، اور جو کھانے کے بعد پی جائے، Liqueur کہلاتی ہے۔ سب لیکوریں بہت تیز، خوشبودار، اور 'میٹھی' ہوتی ہیں۔ انگریزی میں اس لفظ کا تلفظ یوں کرتے ہیں کہ اوّل مکسور ہے اور واؤ معروف۔ غالب نے بھی یہی تلفظ کیا ہوگا۔ اغلب ہے کہ ان کی مراد شارتروز (Chartreuse) سے

ہو جو اُس زمانے کی مقبول فرانسیسی لیکیور تھی۔ اس کا رنگ زردی مائل سبز یا ہلکا زرد ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے آم کے عرق سے اس کی مناسبت ظاہر ہے۔ دوسرا امکان یہ ہے کہ غالب نے لفظ لیکیور سے ایسی برانڈی مراد لی ہو جس میں لیکیور ملا کر اسے خوشبودار کیا گیا ہو، مرتب۔]

اب تک کھانا لگ گیا تھا۔ کھانے کے بعد بیسن سے ہاتھ دھوئے گئے۔ پھر اسی طرح انگنائی میں پلنگ اور صندلی کا اہتمام ہوا۔ حقے کا دور چلا اور باتیں شروع ہوئیں۔ میں نے عرض کیا:

"قبلہ و کعبہ نے کل جو حکیم مومن خاں صاحب کے بارے میں فرمایا تھا کہ طبیعت ان کی معنی آفریں تھی، اس پر کچھ مزید ارشاد ہو۔"

ٹھنڈی سانس بھر کر بولے، "ہاں صاحب، وہ لوگ بھی خوب تھے، اور گوراشاہی کے پہلے کا زمانہ بھی کیا زمانہ تھا۔ اب نظام الدین ممنون کہاں، ذوق کہاں، مومن خاں کہاں۔ ایک آزردہ اور ایک میں، دونوں جینے سے بیزار۔ نہ سخن وری ہے نہ سخن دانی۔ خیر، سنو۔ پرانے بزرگ معنی آفرینی سے مراد لیتے تھے کہ شعر میں کوئی نئی بات ہو، کوئی نیا مضمون ہو، کسی پرانی بات کا کوئی نیا پہلو ہو۔ ورنہ سامنے کی بات تو سب کہہ لیتے ہیں:

وندان تو جملہ در وہانند
چشمان تو زیر ابروانند

کہنے میں کوئی مزہ نہیں۔ یہ کوئی کمال سخن وری نہیں کہ قافیہ سامنے رکھ لیا اور جس قافیے نے جو مضمون سجھایا، بے کھٹکے نظم کر دیا۔ اسی لیے میں کہتا ہوں کہ شاعری قافیہ پیمائی نہیں، معنی آفرینی ہے۔"

تھوڑے سے سکوت کے بعد اُنھوں نے یہ دو شعر بڑے جوش و ذوق سے پڑھے:

عشرت ما معنی نازک بہ دست آوردن است
عید ما نازک خیالاں را ہلال ابن است و بس
می نہم در زیر پائے فکر کرسی از سپہر
تا بکف می آورم یک معنی برجستہ را

اور فرمایا: "میاں سنتے ہو۔ پہلا شعر صائب کا ہے، دوسرا کلیم ہمدانی کا۔ یہ خیال نازک کیا ہے؟ ایسا خیال جو لطیف اور باریک ہو، جو بیان میں آسانی سے نہ آئے۔ اور جب بندھ جائے تو شعر کے اپنے لفظوں کے سوا کسی اور عبارت میں بیان ہو تو وہ بات نہ رہ جائے۔ اسی کو ابو طالب کلیم معنی برجستہ کہتا ہے، اسے حاصل کرنے کے لیے آسمان کی بلندی پار کرنے جیسی محنت کرنی پڑتی ہے۔ اور وہ معنی ایسے ہوتے ہیں کہ ہاتھ میں آئے تو آئے، ورنہ چھوٹ گئے تو چھوٹ گئے۔ فقیر تکیہ نشین غالب کے یہاں ایسے مضامین کی کثرت ہے، کہ جب کوئی مضمون باندھ لیتا ہے تو خود وجد کرتا ہے کہ کیسے اس ہمارے بلند نشین کو پکڑا۔"

میرے منھ سے بے ساختہ نکلا:

آب بود معنی روشن غنی
خوب اگر بستہ شود گوہر است

میرزا صاحب ایک لمحے کو ٹھٹکے، پھر فرمایا، "ہاں اچھی بات کہی۔ نازک مضمون بہتا ہوا پانی ہے، مٹھی میں نہیں آسکتا۔ آ جائے تو گوہر ہی کہلائے۔ معنی روشن سے مراد ہے وہ مضمون جو اپنی تازگی کے باعث صدف سے تازہ نکلے ہوئے موتی کی طرح چمکتا ہو۔"

"سبحان اللہ کیا تعبیر ارشاد فرمائی،" میں نے کہا۔

فرمایا: "خیال بند شاعر وہ ہوتا ہے جو نادر مضامین کی تلاش میں دور دور نکل جانے کی جرأت کر سکے۔ سب سے پہلے خیال بند میاں شاہ نصیر تھے۔ لیکن جس شخص نے اس فن کو معراج پر پہنچایا وہ شیخ ناسخ تھے، کہ تمام شروع سابقہ کے ناسخ ہی ٹھہرے۔ ہم سب نے خیال بندی انھیں سے سیکھی۔ ہاں ان کے کلام میں درد مندی کی وہ کیفیت نہیں جو میر کا خاصہ ہے۔"

"پھر خیال بند شاعر سہل ممتنع تو نہ کہہ سکے گا شاید،" میں نے پوچھا۔

ارشاد ہوا، "ہاں۔ مگر بعض لوگ نبھا بھی لیتے ہیں۔ میں نے کوشش کی ہے اور کامیاب بھی ہوا ہوں۔ لیکن خالص خیال بندی کے ساتھ سہل ممتنع اور درد و کیفیت کا جوڑ در اصل بے نہیں۔ ان دنوں خیال بندی کا چرچا اسی لیے کم ہوتا جاتا ہے۔ تمھارے کانپور کے پڑوس

میں لکھو ہے۔ وہاں ہماری طرف اور طرح کا ایک شاعر ہے، اسی نے آج کل خیال بندی کا چراغ خوب روشن کر رکھا ہے۔"

"غالباً آنجناب کی مراد نواب اصغر علی خان نسیم دہلوی سے ہے" میں نے عرض کیا۔

"ہاں اور آدمی وہ بڑے طنطنے والے ہیں۔ مجھے ایسے لوگ پسند ہیں۔" اُنھوں نے فرمایا۔

"تم نے ان کا شعر سنا ہو گا:

مضمون کے بھی شعر اگر ہوں تو خوب ہیں
کچھ ہو نہیں گئی غزلِ عاشقانہ فرض

میں بھی کہتا ہوں کہ نرے مضامین ہجر و وصال کے درے بھی تو کچھ ہو گا۔ اسے کیوں نہ ٹٹولا جائے۔ نظیری کیا خوب کہتا ہے:

ہزار رنگ دریں کارخانہ درکار است
مگیر نکتہ نظیری ہمہ نکو بستند

تو میاں، دنیا تو بہت بڑی ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ چشمِ تنگ کو وا کریں۔"

مجھے قبلہ و کعبہ کا شعر یاد آ گیا:

حسد سے دل اگر افسردہ ہے گرمِ تماشا ہو
کہ چشمِ تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو

اُنھوں نے مسکرا کر فرمایا۔ "شعر تو آپ کو خوب یاد ہیں، لیکن دیکھیے کہیں رسوا سے رسوا سر بازار نہ ہو جائیے۔ غالب کے چاہنے والے بہت ہیں، لیکن اس کا بُرا چاہنے والے بھی کم نہیں۔"

میں نے کہا، "جناب والا کو تبارک و تعالیٰ نے محسودِ خلائق بنایا۔ اس کی قیمت تو ادا ہی کرنی ہو گی۔"

میرزا صاحب چپ ہو گئے۔ مجھے ہراس ہوا کہ زیادہ بے تکلف تو نہیں ہو گیا۔ لیکن وہ کسی سوچ میں تھے۔ میں بھی دم سادھے رہا۔ اُنھوں نے تھوڑی دیر بعد سر اُٹھایا۔ ارشاد

ہوا، "جمعیت کم، تفرقہ زیادہ۔ خود داری اور کبر نفس اور استغنا، یہ سب خدا داد مجھ میں ہیں۔ پھر دکھ کیوں نہ اُٹھاؤں۔ میرزا بیدل کہہ گئے ہیں:

زندگی در گردنم افتاد بیدل چارہ نیست

لیکن چارہ نہ داشتن کے مضمون پر مجھے بیدل کا یہ شعر بہت اچھا لگتا ہے۔" پھر اُنھوں نے ایک ادائے دردمندی دخود نگری سے شعر پڑھا، گویا اپنے دل داغ دار پر وہ جتنے مغموم ہیں، اتنے ہی متکبر بھی ہیں:

بیدل ز جگر سوختگی چارہ نہ دارم
با داغ مرا لالہ صفت عہد قدیم است

پھر ارشاد ہوا، "زبان د محاورہ الگ، لیکن یہ شخص شہنشاہ معنی تھا۔"

مرزا صاحب پھر خاموش سے ہو گئے۔ شاید شعر کی کیفیت میں گم تھے۔ اتنی دیر میں بھنڈا دوبارہ تازہ ہو کر آگیا۔ پیر و مرشد متوجہ ہوئے تو میں نے عرض کیا، "حضور کل شام کو حاضری کی اجازت ہو۔ پرسوں صبح کی ڈاک سے میں انشاء اللہ چلا جاؤں گا۔"

فرمایا، "ارے، ابھی آئے ابھی چلے۔ اے لو، میاں ذوق کا شعر یاد آگیا:

لیتے ہی دل جو عاشق دل سوز کا چلے
تم آگ لینے آئے تھے کیا آئے کیا چلے

کیا نوکری پر واپس جانے کی عجلت ہے؟"

میں نے گزارش کی، "جی جلدی تو کوئی خاص نہیں لیکن . . ."

"تو کیا گھر پر کوئی منتظر ہے؟"

میرے دل پر چوٹ سی لگی، آنکھیں نم ہونے لگیں۔ "اعلیٰ حضرت، گھر ہے ہی نہیں۔ کانپور میں ہوں ضرور، لیکن غریب الدیار ہوں۔"

میری یہ کیفیت دیکھ کر مرزا صاحب نے بڑے نرم لہجے میں تفصیل پوچھی اور باصرار پوچھی۔ میں نے بھی مجبور ہو کر سب بتا دیا۔ وہ بالکل سناٹے میں آگئے۔ کچھ دیر بعد بولے، "تو تم بھی نسیم صبح گاہی کی طرح خانماں برباد ہو۔ جبھی تو میں کہوں کہ یہ دل درد آشنا اس بچے

کو کہاں سے ملا۔ خیر جاؤ۔ رکتے تو اچھا تھا۔ لیکن تمھاری مرضی۔ ہاں کل شام کو ضرور آ جانا۔"
میں حسب وعدہ رات ڈھلے مرزا صاحب کے دولت کدے پر پہنچا۔ کئی لوگ پہلے سے موجود تھے۔ ایک صاحب، جو مسن اور متین تھے، مرزا صاحب سے کچھ پوچھ رہے تھے۔ طالب علم تو نہیں، لیکن کہیں معلم لگتے تھے۔ قبلہ و کعبہ نے فرمایا، "ذرا وہ شعر پھر پڑھیے، میاں رسوا بھی سن لیں۔"

"حضرت، خاقانی کا شعر ہے،" اُنھوں نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ "ملاحظہ ہو:

دست آب دہ مجاورانش
ارزن دہ برج کوترانش

اس کے معنی مفتی آزردہ صاحب کچھ بتاتے تھے، لیکن میں ٹھیک سے سمجھا نہیں۔"

ارشاد ہوا، "سمجھیں بھی تو آپ کیسے۔ یہ شعر مثنوی "تحفۃ العراقین" کا ہے، اس کے پہلے والے شعر سے اس کا ربط ہے۔ وہ شعر سامنے نہ ہو تو مطلب کیا خاک نکلے۔" پھر ایک لحہ تامل کر کے آپ نے شعر پڑھا:

روح از پے آبروے خود را
خلد از پے رنگ و بوے خود را

"کہیے، اب کچھ سمجھے؟"

"جی، اب کچھ کچھ بات کھل رہی ہے۔" مولوی صاحب بولے۔

"سنیے،" مرزا صاحب نے فرمایا۔ "یہ اشعار خانہ کعبہ کی ثنا میں ہیں۔ اُستاد فرماتے ہیں، روح اپنی افزائش آبرو کے لیے کعبے کے مجاوروں کو وضو کا پانی دیتی ہے۔ اور خلد، اخذ رنگ و بو کے لیے برج کعبۃ اللہ کے کبوتروں کو دانہ کھلاتا ہے۔"

مولوی صاحب بولے۔ "ایک قول یہ ہے کہ 'دست آب دہ' لقب ہے اشرف الانبیا علیہ الصلوٰۃ والسلام کا۔"

مرزا صاحب نے فرمایا، "دیکھو ان اشعار میں فاعل موجود ہے۔ روح، کہ دست آب دہ ہے، اور خلد، کہ ارزن دہ ہے۔ یہاں کون سا قرینہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا

ہے؟"

"جی، قرینہ تو کوئی نہیں، لیکن ایک جگہ خاقانی نے جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے دست آب وہ کہا ہے۔ لوگ اسی سے استنباط کرتے ہیں۔"

"درست، لیکن وہ پورا فقرہ ہے 'وست آب وہ رسالت'۔ یعنی منصب رسالت کو تو ضو کے ذریعہ مزید روشن کرنے والا۔ بے شک یہ صفت حضور نبی آخر الزماں علیہ صلوٰۃ والسلام کی ہو سکتی ہے۔ لیکن اس سے 'دست آب دہ' کے معنی نہیں بدلتے۔ 'دست آب' کے معنی ہیں 'وضو کا پانی'، لہٰذا 'دست آب دہ' کے معنی ہوئے، 'وضو کا پانی دینے والا'۔ اس کے سوا اور کوئی معنی نہیں۔"

مولوی صاحب خاموش ہوئے تو میرزا صاحب اوروں کی طرف متوجہ ہوئے۔ کئی لوگ جمع تھے۔ معلوم ہوا آج داستان گوئی کی محفل ہے۔ کبھی اردو، کبھی فارسی داستان امیر حمزہ سنی جاتی ہے۔ مجھے ذرا تعجب ہوا کہ مرزا صاحب کو ان چیزوں سے بھی رغبت ہے۔ خیر، واستان گو تشریف لائے۔ کھانا ہوا، اس کے بعد داستان گو صاحب ایک مسند کی ٹیک لگا کر ذرا بلند جگہ پر بیٹھے۔ انھوں نے اپنے لیے افیون کا گھولوا تیار کیا، ایک دو چسکیاں لیں۔ پھر داستان آغاز ہوئی۔ شاید میر الحاظ کر کے آج خسرو ہندوستان لندھور بن سعدان کا بیان تھا۔ داستان گو صاحب کیا تھے، گویا ایک کل کی گڑیا تھی کہ لحظہ بہ لحظہ رنگ بدلتی تھی۔ ہر لہجے پر قادر، ہر طرح کے لغات کے ماہر۔ رزم، بزم، طلسم، اور سب سے بڑھ کر عیاری کے وہ وہ قصے کہ لوگ چونک چونک کر اپنی جیبیں ٹٹولتے کہ کہیں عمرو عیار نے ہماری بھی تو جیبیں نہیں تراش دیں۔

گئی رات تک محفل رہی۔ مرزا صاحب نے تقریباً آبدیدہ ہو کر مجھے رخصت کیا۔ صدر دروازے تک چھوڑنے آئے۔ پھر آنے اور خط لکھنے کی تاکید فرمائی۔ اِدھر وہ اندر تشریف لے گئے، اُدھر کلو داروغہ نے ایک ریشمی تھیلی میرے ہاتھ میں پکڑا دی، کہ نواب صاحب نے زاد سفر عنایت کیا ہے۔ میں بھونچکارہ گیا۔ انکار کی تاب تھی اور نہ موقع۔ سرا پر آکر دیکھا تو کیا دن روپے مہری تھے۔

اس ایک بار کے علاوہ میں کبھی دلّی نہ جا سکا۔ خط لکھتے مجھے شرم آتی تھی، لیکن سال میں ایک دو بار کوئی تحفہ میرزا صاحب کے لیے بھجوا دیا کرتا اور دعا کی درخواست کرتا۔ کبھی ملیح آباد کے آم اور جونپور کی امرتیاں، کبھی اپنے مبارک پور کی لنگیاں اور پگڑیاں۔ کبھی کبھی ایک آدھ غزل ہمت کر کے بھیج دیتا۔ لیکن اُنھوں نے اصلاحی غزل کبھی واپس نہ کی۔ شاید وہ مجھے شاگرد نہیں بلکہ حاشیہ بردار تصور کرتے تھے۔ کوئی بھی تعلق اُن سے ہوتا، میرے لیے بہت ہوتا:

فی الجملہ نسبتے بہ تو کافی بود مرا
بلبل ہمیں کہ قافیہ گل شود بس است

وہ مجھے اپنا دوست تصور فرماتے تھے تو میرے لیے اس سے بڑا اعزاز کیا ممکن تھا۔

۱۸۶۸ء میں، انگریزوں کی دار و گیر و رستاخیز کے پورے دس سال بعد، مجھے اپنے کمہار دوست سے خبر ملی کہ میری زمینیں واگزاشت ہو گئی ہیں اور میرے گھرانے کو معافی مل گئی ہے۔ وہاں میرے گھرانے میں تھا ہی کون جو اس معافی سے متمتع ہوتا؟ جس گڑھی میں میرے اجداد ڈھائی سو برس رہے تھے اسے منہدم دیکھنے کے بعد میرے لیے بھی وہاں رہا ہی کیا تھا۔ میری ماں کے ایک عزیز بنارس میں عسرت کی زندگی گزار رہے تھے۔ میں نے انھیں بلا کر سب جائیداد اُنھیں بے قیمت ہبہ کر دی۔ کانپور میں مجھے تنہائی کے سوا کوئی تعب نہ تھا۔ شادی میں نے کی نہیں۔ شاعری خوب چل نکلی تھی۔ توپ کے کارخانے میں تنخواہ اچھی تھی، عزت سے بسر ہو جاتی تھی۔

ایک دن فروری ۱۸۶۹ء کی کوئی تاریخ تھی کہ میں نے "اودھ اخبار" میں پڑھا کہ بلبل ہند، نجم الدولہ، دبیر الملک، میرزا اسد اللہ خان غالب، مالک حقیقی سے جا ملے۔ میں نے آہ سرد بھری اور چپ ہو گیا۔ دل میں کہا، مرزا صاحب فرماتے تھے، اکرام خلاق زمین و زماں سے قلمرو نثر و نظم کا انصرام و انتظام بخوبی ہو چکا۔ اب اگر وہ چاہے گا تو میرا نام تا یوم القیام رہے گا۔ میرے دل نے کہا، آمین، ثم آمین:

لکھا رہے وہ سو برس تک جو لکھ جائے کوئے
لکھنے ہارا باؤلا سو گل گل مٹی ہوئے

میرزا کا نام اُن کے بعد اور بھی چمکا۔ ان کے شاگرد خواجہ حالی نے "یادگارِ غالب" نامی کتاب لکھی، [اوّل اشاعت، ۱۸۹۷ء، مرتب] اس کے خوب چرچے رہے۔ شبلی صاحب نے فارسی مرزا نوشہ کی نہ مانی تو کیا، خواجہ حالی نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ غیر اہلِ زبان بھی فارسی پر قدرت تامہ رکھ سکتا ہے، اور میرزا صاحب کو یہ قدرت حاصل تھی۔ لاہور سے مولانا محمد حسین آزاد نے اپنی کتاب "آبِ حیات" چھپوائی [اوّل اشاعت، ۱۸۸۰ء، مرتب] تو اس میں میرزا صاحب کی باتیں ایسے مزے مزے کی لکھیں کہ لوگوں میں میرزا صاحب کا نام اپنے دوستوں کے ناموں سا مانوس ہو گیا۔ ابھی کچھ برس پہلے عظیم آباد کے کوئی صاحب ہیں، صلاح الدین خدا بخش، اُنھوں نے مرزا صاحب کا موازنہ جرمن کے کسی بہت بڑے شاعر سے کیا ہے اور لکھا ہے کہ مرزا صاحب کو اس پر تفوق ہے۔ [یہ مضمون ۱۹۱۰ میں چھپا تھا، اس میں صلاح الدین خدا بخش نے غالب کو عظیم جرمن رومانی شاعر ہائنہ (۱۷۹۷ء تا ۱۸۵۶ء) پر فوقیت دی تھی، مرتب۔]

میں نے کہیں سنا کہ بھوپال میں کوئی ہونہار نوجوان بجنوری نام کے ہیں۔ اُنھوں نے مرزا صاحب قبلہ کے بارے میں کچھ لکھا ہے، اور ثابت کیا ہے کہ ہمارے صاحب کا مرتبہ کسی یورپین شاعر سے کم نہیں۔ لیکن ان کی یہ تحریر ابھی منظر عام پر نہیں آئی ہے۔ سنا جاتا ہے بجنوری صاحب ان دنوں بہت بیمار ہیں، اللہ اُنھیں شفا دے۔ [عبدالرحمٰن بجنوری کی جس تحریر کا ذکر بینی مادھو رسوا نے کیا ہے وہ نامکمل رہی اور بجنوری کے انتقال کے بعد "محاسن کلامِ غالب" کے نام سے نسخۂ حمیدیہ کے دیباچے کے طور پر بھوپال سے ۱۹۲۱ء میں شائع ہوئی اور نقدِ غالب میں اہم مقام کی مستحق قرار پائی۔ بجنوری کا انتقال ۱۹۱۸ء ہی میں ہو گیا۔ اس وقت ان کی عمر صرف ۳۳ برس کی تھی، مرتب۔]

تھوڑی بہت انگریزی میں نے بھی پڑھی ہے۔ اتنا تو میں ڈنکے کی چوٹ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے کسی انگریزی نظم میں وہ روانی اور وہ شوخی نہیں دیکھی جو میرے صاحب و قبلہ کے اکثر اشعار میں ملتی ہے۔ میرے محبان صادق الوداد حضرت نادر علی خاں نادر کاکوروی اور حضرت درگا سہائے سرور جہان آبادی نے انگریزی کے وافر ترجموں سے دامنِ اردو کو مالا مال

کیا ہے۔ لیکن میں دبی زبان سے کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ ان میں سے کوئی نظم مرزا نوشہ یا میر تقی کے مرتبے کو نہیں پہنچتی۔ دوسری زبان سے ترجمہ کرنے میں کچھ نہ کچھ ضائع ضرور ہوتا ہوگا، یہ بات بھی ہے۔

مرزا صاحب کے مشکل اشعار کے معنی تو لوگ خود ان سے بھی پوچھ لیتے تھے، لیکن ان کے معتد بہ اشعار اردو کی شرح ذرگا پرشاد صاحب نادر دہلوی کے ایک لائق شاگرد میاں حلم بریلوی نے لکھی۔ سنا گیا کہ ان کے سارے اردو کلام کی شرح خواجہ بدرالدین راقم نے حیدر آباد جا کر لکھی تھی۔ لیکن وہ مرہون انطباع نہ ہوئی۔ پھر حیدر آباد ہی سے مولوی سید علی حیدر نظم طباطبائی نے اپنی شرح چھپوا کر عام کی [اول اشاعت ۱۹۰۰ء، مرتب۔] مولوی صاحب کی علمیت اور شعر فہمی میں شک کسی کافر کو ہوگا، لیکن ان کی شرح کو غیر جانب داری سے پڑھیے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اُنھیں مرزا صاحب مغفور سے کچھ کد ہے۔ ستائش وہ خوب کرتے ہیں، نکتے وہ عمدہ نکالتے ہیں۔ لیکن یہ بھی لگتا ہے کہ خواہ مخواہ کی عیب چینی بغیر اُنھیں چین نہیں۔

کچھ دن ہوئے ایک علی گڑھ کے بی۔ اے۔ پاس صاحب نے، جو کانپور ہی میں مقیم ہیں، میرزا صاحب کے دیوان کے ساتھ بعض بعض اشعار کی شرح بھی شائع کی ہے [اول اشاعت ۱۹۱۱ء، مرتب۔] حسرت موہانی ان کا نام ہے۔ ان دنوں قومی تحریکات میں حصہ لینے کے باعث جیل خانے میں ہیں۔ بڑے لائق اور گرما گرم شخص ہیں۔ شرحیں ان کی نہایت مختصر لیکن بڑی معنی خیز ہیں۔ شعر کا اچھا ذوق رکھتے ہیں۔ منشی تسلیم لکھنوی کے شاگرد ہیں۔ اس لحاظ سے نواب نسیم دہلوی ان کے دادا اُستاد ٹھہرے۔ منشی تسلیم صاحب کا ایک شعر مجھے مزہ دیتا ہے:

میں تو ہوں تسلیم شاگردِ نسیمؔ دہلوی
مجھ کو طرزِ شاعرانِ لکھنؤ سے کیا غرض

ان دنوں لکھنؤ، دلی میں پھر تھوڑی بہت ٹھنی ہوئی ہے، درحالے کہ میر انشاءاللہ خاں انشا نے تو صاف صاف اُنھیں لکھنؤ والوں کو لائق اعتنا گردانا ہے جو براہ راست دہلی سے آئے

ہوں، اور لکھؤ میں جن کے گھر پچاس برس سے زیادہ پرانے نہ ہوں۔ اور یہ اُنھوں نے اس وقت کہا جب اودھ پر مرزا منگلی کا راج تھا۔ وہ جنت آرام گاہ اپنی زبان کو شاید دہلی ہی کی زبان قرار دیتے تھے۔ [ملاحظہ ہو "دریائے لطافت"، محررہ ۱۸۰۷ء، اوّل اشاعت ۱۸۵۰ء، مرتب۔] اتنا تو میں بھی کہہ سکتا ہوں کہ ہمارے میر زا صاحب میں ایسا کوئی تعصب نہ تھا۔ وہ شیخ ناسخ کے بھی قائل تھے اور خواجہ آتش کے بھی۔ ایک بار بے خیالی میں اُنھوں نے مرزا رجب علی بیگ سرور کی تصنیف "فسانۂ عجائب" پر بڑے سخت جملے کہے تھے۔ لیکن ان اقوال میں تعصب نہ تھا، اپنی رائے کا بےلاگ اظہار تھا۔ یہ ضرور ہے کہ مرزا صاحب خود اپنی زبان کے تئیں فرماتے تھے کہ اوروں کی نسبت فصیح تر ہے۔

میرزا صاحب مغفور کے ارتحال کی تاریخیں بہت کہی گئیں۔ مولوی حالی نے غضب کا مرثیہ کہا۔ میرا جی بہت چاہا کہ میں بھی مرثیہ کہوں۔ لیکن کبھی ایک دو مصرعے سے آگے نہ بڑھ سکا۔ خدا معلوم کیوں رقت طاری ہو جاتی۔ لگتا کہ اپنے باپ دادا کا بھی مرثیہ کہہ رہا ہوں۔

مرزا صاحب کے گزرنے کی خبر کے کئی دن بعد تک میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ان کا تعزیہ کسے دوں۔ آخر دادا میاں کی درگاہ پر پانچ سیر شیرینی اور پانچ سیر کی شیر مالیں فاتحہ کرائیں اور تقسیم کر دیں۔ گھر آ کر مرزا صاحب کی یادگار تحریر کو آنکھوں سے لگا کر دو آنسو رو لیا۔

آج جب کہ نومبر ۱۹۱۸ء کی آخری تاریخ ہے، میں انگریزی حساب سے اٹھتر برس کا ہو گیا۔ اتنی عمر بہت ہوتی ہے، اُمید ہے کہ جلد ہی میرا بلاوا آ جائے گا۔ کہنے کی باتیں تو اور بھی تھیں:

گفتی کہ چرا حال دل خویش نہ گوئی
من خود کنم آغاز بہ پایاں کہ رساند

میں نے وہی باتیں لکھی ہیں جن سے پڑھنے والے (اگر ان پراگندہ خیالیوں کا کوئی پڑھنے والا ہوا) کو یہ تو معلوم ہو کہ میں کون تھا اور کن کن سے شرف ہم کلامی مجھے حاصل رہا

ہے۔ گزری باتوں کو پچاس سے زیادہ سال ہونے کو آئے، لیکن لگتا ہے ابھی ابھی اُنھیں خواب میں دیکھ کر اُٹھا ہوں۔ میرے باپ ماں کی من موہنی صورتیں، دادا جان اور مولوی خادم حسین ناظم کے نورانی چہرے، پوپلیاں راج کی سرحد پر انگریزی فوج کا ہجوم اور ڈنکا شاہ کا ماتم کرتی ہوئی اور پوپلیاں کے راجہ کو کوستی ہوئی عورتیں۔

میرزا صاحب کی بارعب شخصیت، جس میں بلا کا حسن بھی تھا اور شوخی کے ساتھ عجب طرح کا حزن بھی۔ نواب ضیاء الدین خاں اور منشی شیو نرائن آرام۔ میر کاظم علی داستان گو۔ دِلّی کے اُجڑے بچڑے کوچہ و بازار، جن میں پھر بھی ایک غرور، ایک گردن افرازی کی شان تھی۔

اور میر امامن، میرا کھمار دوست، اور وہ جسے بھی ۱۸۵۷ء نے کھالیا۔ جس پر کبھی میری نگاہ پڑتی تھی۔ شاہ حاتم نے شاید ہم جیسوں کے ہی لیے کہا تھا:

اس وقت دل مرا ترے پنجے کے بیچ تھا
جس وقت تو نے ہاتھ لگایا تھا ہات کو
سب جان و تن ملا تھا نہ تھا کچھ خلل مگر
دونوں کے دل اس آن ترستے تھے بات کو

انگریز اتنی بڑی لڑائی ہارتے ہارتے جیت گیا۔ جرمن کو بھی شکست ہوئی۔ میرزا صاحب فرماتے تھے کہ غوث علی شاہ صاحب کا قول تھا، انگریز کا اقبال بلند ہے اس لیے اس کی عورتوں پر جن بھوت بھی نہیں آتا۔ اب میں اپنے جیتے جی تو اس اقبال میں گھن لگتے نہ دیکھ سکوں گا۔ اللہ بس باقی ہوس۔

اردو کی ادبی تاریخیں

ڈاکٹر گیان چند

قیمت: ۵۰۴ روپے صفحات: ۹۴۴

اردو کی ادبی تاریخوں کے اس جائزہ میں مصنف نے ادبی تاریخ نگاری کے پس منظر اور ارتقا کے پیش نظر آب حیات، شعر الہند، گل رعنا، اردو ادب کی تاریخ، تاریخ نثر اردو، داستان تاریخ اردو، مرۃ الشعراء، اردو کی ادبی تاریخ، علی گڑھ تاریخ ادب اردو، اردو کی کہانی، اردو ادب کی تنقیدی تاریخ، ادبیات مسلمان پاکستان و ہند، کلاسیکی اردو ادب، تاریخ اقلیم ادب، مختصر تاریخ ادب اردو، تاریخ نظم و نثر اردو، اردو شاعری کی مختصر تاریخ، تعارف تاریخ اردو، اردو ادب کا تعارف جیسی منتخب تاریخ کے تفصیلی ذکر کے ساتھ ساتھ رالف رسل، این میری شمل، گراہم بیلی، رام بابو سکسینہ، علی جواد زیدی، محمد صادق کی انگریزی میں لکھی گئیں اردو ادب کی تاریخوں کے جائزہ کے ساتھ ہی ادبی تاریخوں کے ارتقا کا بھرپور جائزہ اور تجزیہ پیش کیا ہے جو اردو ادب کی تاریخ کے حوالے سے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

غالب کے خطوط (جلد پنجم)

ڈاکٹر خلیق انجم

قیمت: ۱۰۰ روپے صفحات: ۱۶۶

غالب کے خطوط کو نہ صرف برصغیر پاک و ہند بلکہ پوری ادبی دنیا میں ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت حاصل ہے۔ غالب شناسی کے حوالے سے ادب کے قارئین یقیناً اس کتاب سے استفادہ کریں گے۔

جدید اردو افسانے کے رجحانات

ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش

قیمت: ۳۲۰ روپے　　صفحات: ۶۹۶

یہ کتاب ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش کا تحقیقی مقالہ ہے جس پر پنجاب یونی ورسٹی نے انھیں پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے افسانے کے خدوخال سے لے کر افسانے کے ارتقا کا جائزہ لیتے ہوئے جدید اردو افسانے کے ابتدائی نقوش، اس کے پس منظر میں افسانے کے رومانی دور سے حقیقت پسندی، ترقی پسند رجحانات کے ساتھ ساتھ سماجی، معاشی اور تہذیبی تبدیلیوں میں پیدا ہونے والی نفسیاتی کشمکش اور رویوں کا تفصیلی تجزیہ پیش کیا ہے اور ان میں جدیدیت، علامت نگاری، تجریدیت اور ماضی کی بازیافت جیسے میلانات کے حوالے سے جدید افسانے کو پرکھنے کی کاوش کی ہے۔

نوادر ظفر

مرتب: شان الحق حقی

قیمت: ۲۰۰ روپے　　صفحات: ۳۵۲

مغلیہ سلطنت کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر جن کی قیادت اور رہنمائی میں انگریزوں کے خلاف علم بغاوت بلند ہوا اور ۱۸۵۷ء میں آزادی کی جنگ لڑی گئی۔! نمی بہادر شاہ ظفر کے مختلف مجموعہ شاعری کا یہ ایک نمایندہ اور معتبر انتخاب ہے جس میں فاضل مرتبِ شان الحق حقی کا عالمانہ مقدمہ بھی شامل اشاعت ہے۔ شان الحق حقی نے اس مقدمہ میں بہادر شاہ ظفر کی ادبی اور شعری خصوصیات کا تجزیہ کرتے ہوئے ان کے ادبی مرتبے کا تعین کیا ہے۔

مثنویات شوق

مرتب: رشید حسن خاں

قیمت: ۲۰۰ روپے　　　صفحات: ۴۰۶

نواب مرزا شوق کی مثنویاں "فریب عشق"، "بہار عشق"، "زہر عشق"، دبستان لکھنؤ کے اعلیٰ ادبی ذوق کی مظہر ہیں۔ اردو زبان کی وہ نفاست اور لطافت جو ان مثنویوں میں ملتی ہے اس کی مثال دیگر مثنویات میں کم ہی دکھائی دیتی ہے۔ محاورات پر عبور، روزمرہ پر قدرت اور اسلوب وبیان کی جو سلاست ان مثنویوں میں موجود ہے اس کے ساجی محرکات اور تہذیبی اثرات کے مطالعہ کے لیے ان مثنویوں کو پڑھا جانا ضروری ہے۔ رشید حسن خاں برصغیر کے اہم ترین محقق ہیں اور کلاسیکی متن مرتب کرنے میں درجہ استناد رکھتے ہیں۔ اس مجموعے میں پہلی مرتبہ ان مثنویوں کا مستند متن پیش کیا گیا ہے۔ تعلیقات وحواشی اور فرہنگ کے اعتبار سے بھی یہ ایک بے مثال تحقیقی وعلمی کارنامہ ہے۔

ایک وارڈن کی ڈائری

مترجم: احفاظ الرحمٰن

قیمت: ۱۰۰ روپے　　　صفحات: ۱۵۸

یہ جدید چین کی چھ انعام یافتہ کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ جس میں چین کے مشہور افسانہ نگار "لیو شین وو"، "چھی پیینگ"، "وانگ یا پیینگ"، "پاؤ چوان"، "وانگ منگ"، "موکو چانگ" کے افسانوی تراجم شامل ہیں۔ ان افسانوں کو مشہور صحافی اور ادیب جناب احفاظ الرحمٰن نے سلیس اور آسان زبان میں منتقل کیا ہے، احفاظ الرحمٰن خود بھی بیجنگ کے دارالترجمہ واشاعت اور وہاں سے نکلنے والے اردو رسالے "چین باتصویر" سے کافی عرصہ منسلک رہے ہیں۔

افکار عالیہ

مترجم: ڈاکٹر خان رشید / قاضی قیصر الاسلام

قیمت: ۱۳۰ روپے　　　صفحات: ۲۲۷

اس کتاب میں فن، اتفاق، تغیر، جذبہ، حسن، عدل، فرض، تاریخ اور ارتقا جیسے موضوعات پر مغرب کے عظیم مفکرین کے افکار و خیالات کو مختصر ترغلامے کے طور پر پیش کیا گیا ہے جن کو ڈاکٹر خان رشید اور قاضی قیصر الاسلام نے اردو کا جامہ پہنایا ہے۔ وہ لوگ جو مشرقی فکر سے بڑی حد تک آگاہ ہونے کے باوجود مغرب سے ویسی آگاہی نہیں رکھتے ان کے لیے یہ مواد دلچسپی اور فکر انگیزی کا حامل ہے۔

شاہد احمد دہلوی حالات و آثار

ڈاکٹر سید محمد عارف

قیمت: ۲۰۰ روپے　　　صفحات: ۳۲۷

شاہد احمد دہلوی معروف ادیب، مترجم اور مشہور ادبی ماہنامہ "ساقی" کے مدیر تھے۔ وہ ڈپٹی نذیر احمد کے خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں جن کے وہ پوتے تھے۔ یہ کتاب ڈاکٹر سید محمد عارف کا پی ایچ ڈی کے لیے تحریر کیا جانے والا مقالہ ہے جس پر اسلامیہ یونی ورسٹی بہاول پور نے انھیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض کی ہے۔ شاہد احمد دہلوی کی ادبی خدمات کے حوالے سے تحریر کیا جانے والا یہ پہلا مقالہ ہے۔

مصنف کے کوائف

نام: شمس الرحمٰن فاروقی

پیدائش: ۳۰ ستمبر ۱۹۳۵ء، انڈیا

محکمہ ڈاک و تار کے اعلیٰ عہدہ سے ریٹائر ہوئے

تصانیف:

لفظ و معنی

گنج سوختہ

عروض آہنگ اور بیان

شعریات

اثبات و نفی

افسانے کی حمایت میں

The Secret Mirror

شعر شور انگیز

شعر غیر شعر اور نثر

داستان امیر حمزہ